دسمبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ماہنامہ
میثاق
لاہور

عدد ٦	دسمبر ١٩٦٦ء	جلد ١٢

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ —— ادارہ —— کور کے صفحات ٢، ٣، ۴

تدبر قرآن —— مولانا امین احسن اصلاحی

★ مقدمہ (٣) صفحہ ١

★ تفسیر سورۂ آل عمران (١٢) " ١١

مقالات ——————

★ زکوٰۃ (۵) خالد مسعود " ٢٦

تحریک جماعت اسلامی (٢) —— اسرار احمد

★ نقض غزل (۴) " ٣٣

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر مسئول
اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات
دار الاشاعت الاسلامیہ
بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر، لاہور- ١

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

مقدمہ

(۳)

دو سوال اور ان کے جواب

بعض لوگ جو نظم کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ عموماً اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دو سوال اٹھاتے ہیں - ایک یہ کہ نظم اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت نکات اور لطائف کی ہے، اس کے اوپر قرآن کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا انحصار نہیں ہے پھر اس پر اس شدومد سے زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا یہ کہ اگر قرآن میں نظم ہے تو آخر اس قدر مخفی قسم کا کیوں ہے کہ صرف خال خال لوگ ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے اور وہ بھی برسوں کی جانکاہی اور دماغ سوزی کے بعد - یہاں مختصر طور پر ہم ان دونوں سوالوں کے جواب بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں۔

نظم کی قدر و قیمت

نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے - ہمارے نزدیک اس کی اصلی قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور مفرد قسم کی ہدایات ہیں - اگرچہ ایک اعلیٰ کتاب کے منفرد احکام اور اس کی مفرد ہدایات کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس بات میں کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات و خواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزا سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دے دے۔ تاج محل کی تعمیر میں جو مسالا استعمال ہوا ہے وہ الگ الگ دنیا کی بہت سی عمارتوں میں استعمال ہوا ہو گا لیکن اس کے باوجود تاج محل دنیا میں ایک ہی ہے - میں بلا تشبیہ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم بھی

جن الفاظ اور فقروں سے ترکیب پایا ہے وہ بہرحال عربی لغت اور زبان ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں لیکن قرآن کی لاہوتی ترتیب نے ان کو وہ جمال و کمال بخش دیا ہے کہ اس زمین کی کوئی چیز بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں اسی طرح نیکیوں اور بدیوں کے بھی شجرے ہیں بعض اوقات ایک نیکی کو ہم معمولی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نیکی کا تعلق نیکیوں کے اس خاندان سے ہوتا ہے جس سے تمام بڑی نیکیوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایک برائی کو ہم معمولی برائی سمجھتے ہیں لیکن وہ برائیوں کے اس کنبے سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے جو تمام مہلک بیماریوں کو جنم دینے والا کنبہ ہے۔ جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دق کا پتہ دینے والی بیماری کو نزلے کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش قرار دے دے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظم کلام سے واضح ہوتی ہے اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورہ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی و نفسی یا تاریخی دلائل بیان کئے ہیں۔ یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جس شخص پر یہ ترتیب واضح ہو وہ جب اس سورہ کی تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ۔

زیر بحث موضوع پر اس نے ایک نہایت جامع، مدلل اور شرح صدر بخشنے والا خطبہ پڑھا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس ترتیب سے بے خبر ہو وہ اجزا سے اگرچہ واقف ہوتا ہے لیکن اس حکمت سے وہ بالکل ہی محروم رہتا ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہوتی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا علمی و نظری پہلو ہوا۔ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن مجید کی حبل اللہ المتین ہی کے ذریعے سے ہوئی ہے اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی

کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور متفرق نہ ہوں۔ اس ہدایت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلاف پیدا ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے۔ کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق و سباق اور نظام ہی ہو سکتے ہیں لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا، اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

فقہی اختلافات سے زیادہ سنگین معاملہ گمراہ فرقوں کی ضلالتوں کا ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے قرآنی آیات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹا اور پھر جو جی میں آیا، اس کے اندر معنی پہنا دیے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلام کو اس کے نظم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے اندر آپ معنی پہنانا چاہیں تو بہت سے معنی پہنا سکتے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصوّر اس قول کا کہنے والا کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں بہت سی ایسی آیتوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو تحریروں اور تقریروں میں نہایت غلط اور گمراہ کن معنوں میں استعمال ہو رہی ہیں لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا تکلیف کر کے یہ دیکھ لے کہ آیت کس موقع و محل اور کس سیاق و سباق کی ہے۔ کیونکہ قرآن کے معاملے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے نزدیک نظم اور موقع و محل کا کوئی سوال ہی سرے سے نہیں ہے۔

میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیئے

زبان کی اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا، بلکہ ذہنی وفکری صعود کے ذریعے سے اس بُعدِ زمانی پر بھی غالب آنا پڑیگا جو اس کے اور قرآن کے زمانۂ نزول کے درمیان حائل ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ ایک عظیم فکری وعلمی جہاد کے بعد ہی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزا اور اس کی ترکیب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اجزا کا علم بہت آسان ہوتا ہے لیکن ترکیب کے علم کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ نظم کا علم درحقیقت ترکیب کا علم ہے۔ یہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت سے فلاں آیت کا کیا جوڑ ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد دین و اخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو واضح کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک نہایت اعلیٰ مقصد ہے، اسی چیز کو حکمت کہتے ہیں۔ حکمت بہرحال ایک مخفی خزانہ ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف یہ جاننا چاہے کہ قرآن نے عملی زندگی کے لیے کیا احکام دیئے ہیں تو اس کے لیے اسے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص دین کی حکمت معلوم کرنا چاہے تو اسے بہرحال قرآن کے اندر معتکف ہونا اور اس کے لئے ساری زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان کی (بالخصوص اس زبان کی جس میں قرآن ہے) کچھ خصوصیات ہیں جو صرف اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ بلیغ عربی زبان میں تعبیر مدعا کے لیے الفاظ کا سہارا اسی حد تک لیا جاتا ہے جس حد تک ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ کلام کا عیب ہے جس کو قائل کے عجز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ نہایت ذہین تھے۔ اس وجہ سے وہ کلام کے اندر سے ان تمام اجزا کو حذف کر دیتے تھے جن کو ایک ذہین سامع خود سمجھ لیتا ہے یا اسے سمجھ لینا چاہیئے۔ زمانۂ نزول قرآن کے ادب اور قرآن کے مطالعے سے اس حذف و ایجاز کے بہت سے اصول سامنے آتے ہیں جو ایک فنی ترتیب کے ساتھ میرے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی ایک کتاب، ـــ کتاب الاسالیب ـــ میں جمع کر دیئے ہیں۔ میرے لیے ان تمام اصولوں کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک بات محض بطور مثال عرض کرتا ہوں جس سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا جس کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اور اہل عرب کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم ایک بات کے بعد جب دوسری بات اس کی دلیل یا اس کی مثال یا اس کے نتیجہ یا اس کی تکمیل یا اس

پر استدراک یا کسی اور پہلو سے کہیں گے تو اس رابطہ کو لازماً ظاہر کر دیں گے جو دونوں کے تعلق کی نوعیت کو واضح کرے۔ اس مدعا کے لیے ہماری زبان میں بہت سے الفاظ اور اسلوب ہیں جن کا سہارا لیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اہل عرب کا طریقہ اس معاملے میں ہمارے طریقے سے بالکل مختلف ہے وہ اس طرح کے مواقع میں زیادہ اعتماد سامع کی ذہانت پر کرتے ہیں اور رابطہ کو حذف کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن خود اس خلا کو بھر لے گا۔ اہل عرب اس حذف و ایجاز کو کلام کا حسن اور اس کی بلاغت قرار دیتے ہیں لیکن یہی چیز ہمارے لیے نظم کی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ہم کلام کی مخفی کڑیوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہر بات کو الگ الگ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اس میں تمام علم اولین و آخرین ہے۔ اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لیے تمام صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی۔ قوموں کے بعد قومیں اٹھیں گی اور ان میں سے جو اس کی طرف رجوع کریں گی وہ سب اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصہ پائیں گی لیکن سب کے حصہ پانے کے بعد بھی اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سمندر سے ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے، قیامت تک سب مل کر بھی اس سے زیادہ اس کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ سارا خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس کی نوعیت کسی سپاٹ کتاب کی نہیں ہے کہ آپ اسکو دو چار مرتبہ پڑھ لیں اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو اخذ کر لیں بلکہ اس کی حیثیت ایک معدن کی سی ہے جس کے اندر جتنی ہی گہری کھدائی کی جائے اتنے ہی اس سے خزانے پر خزانے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک دو بار پڑھ لینے کی ہدایت نہیں ہوئی بلکہ بار بار مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں تلاوت کرتے رہنے اور اس پر برابر تدبر کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی۔

قرآن کا نظام بحیثیت مجموعی اور جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ہر سورہ کے اندرونی نظم سے ہے۔ یعنی ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے، اس کا

ایک علیحدہ عنوان و موضوع (عمود) ہے اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور و تدبر سے سامنے آتا ہے۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر بالاجمال روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کے ظاہری پہلو پر نظر ڈالیے۔

قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو

اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی، کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں، ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔ پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے، باقی چار مدنی ہیں۔ دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے ۱۰ سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورۂ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۰ سورتیں مکی ہیں آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ مکی ہیں اور آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے اس میں پہلے سات مکی ہیں، اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورۂ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورۂ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن شریف سنتے سناتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنی نے مصحف کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے مجموعی نظام کا مخفی پہلو

مذکورہ ساتوں گروپوں کی تلاوت اگر بار بار غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس ترتیب کی بہت سی حکمتیں واضح ہوتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

(۱) جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں، اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہوتا ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اس جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہوتی ہیں۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہوتے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہوتی ہے۔ الگ الگ ہر گروپ کے موضوع پر بحث کے لیے موزوں جگہ یہاں نہیں ہے بلکہ تفسیر میں ہر گروپ کی تمہید میں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ کسی گروپ میں قانون و شریعت کا رنگ غالب ہے کسی میں ملت ابراہیمؑ کی تاریخ اور اس کے اصول و فروع کا، کسی میں کشمکش حق و باطل اور اس کے بارے میں سنت الٰہیہ کے بیان کا حصہ نمایاں ہے، کسی میں نبوت و رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات کا کسی میں توحید اور اس کے لوازم و مقتضیات ابھرے ہوئے نظر آئیں گے، کسی میں بعث اور حشر و نشر اور اُنکے

متعلقات۔ آخری گروپ منذرات کا ہے جو بیشتر ان مکی سورتوں پر مشتمل ہے جو جھنجھوڑنے اور جگانے والی ہیں اور جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل برپا کر دی۔

۲۔ ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں وہ اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ وہ اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت رکھتی ہیں جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

۳۔ ہر سورہ زوج زوج ہے۔ یعنی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہوتی ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے، دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے اور اس طرح دونوں مل کر چاند اور سورج کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی سورتوں میں اس کو بقرہ اور آل عمران کی مثال سے اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کی مثال سے سمجھیے۔ قرآن میں یہ نظام بالکل کائنات کے نظام کے مشابہ ہے۔ اس کائنات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نمازوں میں بالعموم سورتوں کی تلاوت میں اس نسبت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ سورہ قیامہ اور دہر، سورہ صف اور سورہ جمعہ، اعلیٰ اور غاشیہ عموماً آپ نمازوں میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

۴۔ صرف سورہ فاتحہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ درحقیقت پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ ہے۔ اس سورہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اس نے اپنے اندر پورے قرآن کے بنیادی حقائق جمع کر لیے ہیں۔ یہ اپنے گروپ کے لیے بھی دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے اور پورے قرآن کے لیے بھی۔ اس کے مختلف ناموں میں سے ایک نام کافیہ بھی ہے۔ اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خود مکتفی سورت ہے۔ یہ اپنے ساتھ کسی دوسری سورت کے ملنے کی محتاج نہیں ہے۔

۵۔ بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے۔ یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق سورہ کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے

طور پر نازل ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال سورہ حجرات ہے۔ جو اپنی سابق سورہ کی ایک آیت کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس کی وضاحت آئے گی۔

۶۔ ہر گروپ پر الگ الگ تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہر ایک کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوتے ہیں البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہوتا ہے، نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہوتے ہیں۔

۷۔ یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو تمام دوسرے گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور منذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انذار سے مقصود درحقیقت لوگوں کو غلط راہ سے موڑ کر صحیح راہ پر لگانا ہے اور صحیح راہ شریعت کی راہ ہے۔ اس وجہ سے جو چیز غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے اس پر سب سے پہلے نگاہ پڑنی چاہیئے۔ امت کو بحیثیت اُمتِ مسلمہ جو دولت عطا ہوئی ہے وہ درحقیقت شریعت ہی ہے جو اہلِ کتاب سے اس امت کو منتقل ہوئی۔ اس وجہ سے پہلے گروپ میں اہل کتاب کی معزولی بھی بیان ہوئی اور شریعت اسلامی کی تفصیل بھی۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے پہلے گروپ اور اس کے آخری گروپ میں وہی نسبت ہے جو نسبت ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتی ہے۔ جہاں تک تعمیر کا تعلق ہے تعمیر پہلے بنیاد ہوتی ہے، لیکن عمارت بن چکنے کے بعد سامنے جو چیز آتی ہے وہ عمارت ہوتی ہے۔ بنیاد نیچے ہو جاتی ہے۔

جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن "ولقد اٰتینٰک سبعا من المثانی والقرآن العظیم" (۸۷-حجر) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، لیکن اس آیت سے متعلق چونکہ بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ اس وجہ سے اس پر مفصل گفتگو اپنے مقام پر ہی ہوتی رہے گی۔

(باقی)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ آلِ عمران

(۱۲)

۳۶۔ آگے کا مضمون آیات ۱۵۶۔۱۸۹

آیات ۱۵۶-۱۸۹

جنگ احد سے پیدا شدہ حالات وخیالات پر جو تبصرہ اوپر سے چلا آرہا ہے اسی سلسلے کی کچھ مزید باتیں ارشاد ہو رہی ہیں :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا
ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا
قُتِلُوْا ج لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ط
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝١٥٦ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝١٥٧ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ
لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝١٥٨ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ
فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝١٥٩ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ج وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ
فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝١٦٠
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ط وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ
تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝١٦١ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ
بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝١٦٢ هُمْ دَرَجٰتٌ
عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝١٦٣ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ

بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿١٦٤﴾ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم
مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ
اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ
تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ
فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ
أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ
لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾
يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾
الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ
أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٢﴾ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ
جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ ۙ وَ
اتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿١٧٤﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ
أَوْلِيَاءَهُ ۖ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧٥﴾ وَلَا يَحْزُنكَ الَّذِينَ
يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ
لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ
بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا

اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ
اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى
الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ
وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ
اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ
مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ
نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ
لِّلْعَبِيْدِ ۝ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى
يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ
فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ
الْمُنِيْرِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَ
لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا
اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَاِذْ
اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ
فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝
لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اے ایمان والو! ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنہوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں کے بابت جب کہ وہ سفر کرتے ہیں یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے نہ قتل ہوتے۔ یہ خیال ان کے اندر اس لئے پیدا ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعث حسرت بنائے۔ اللہ ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے یا مرو گے تو وہ مغفرت اور رحمت جو تمہیں حاصل ہوگی اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں اور تم مرو یا قتل ہو، بہرحال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے۔" (۱۵۶-۱۵۸)

"یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ چھوڑ دیگا تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی کے اوپر چاہیئے کہ بھروسہ کریں اہل ایمان" (۱۵۹-۱۶۰)

"اور ایک نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بددیانتی کرے اور جو کوئی بددیانتی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بددیانتی سمیت پیش ہوگا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ کیا وہ جو خدا کی خوشنودی کا طالب ہو، اس کے مانند ہو جائیگا جو خدا کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ خدا کے ہاں انکے درجے الگ الگ ہوں گے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔" (۱۶۱-۱۶۳)

"یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول

مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے بے شک یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" (۱۶۴)

"اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی جس کی دونی مصیبت تم نے پہنچائی۔ تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو یہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے اور دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن تمہیں جو مصیبت پہنچی یہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کر دے اور ان منافقین کو بھی ممیز کر دے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفع کرو۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں نہ قتل ہوتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کر لو اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں انہیں روزی مل رہی ہے، فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ ان اہل ایمان کے اجر کو جنہوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہی۔ ان میں سے جنہوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے ہیں اور جو تقوے کی راہ چلے ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں

نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکھٹی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کیساتھ واپس آئے، ان کو ذرا گزند نہ پہنچا، اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کو ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو" (۱۷۵-۱۷۳)

"اور یہ لوگ تمہارے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بے شک جنہوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑیں گے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے یہ نہ گمان کریں کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں کوئی بہتر بات ہے۔ ہم تو بس اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ کچھ گناہ ہیں اور اضافہ کرلیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے" (۱۷۸-۱۷۶)

"اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کو جس حال پر تم تھے اسی پر، خبیث کو طیّب سے الگ کیے بغیر، چھوڑے رکھے اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمہیں سارے غیب سے باخبر کردے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقوٰی اختیار کیا تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے" (۱۷۹)

"اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے، یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ آن کے حق میں بہت بُرا ہے۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان

کو طوق پہنایا جائے گا اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتل انبیاء کو بھی اور کہیں گے کہ اب چکھو عذاب آگ کا۔ یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں" (۱۸۰-۱۸۲)

"جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کی بات باور نہ کریں جب تک یہ وہ قربانی پیش نہ کرے جس کو کھانے کے لیے آگ اترے، ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا، اگر تم سچے ہو؟ پس اگر یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے" (۱۸۳-۱۸۵)

"تمہارے مال اور تمہاری جان میں تمہاری آزمائش بھی ہوتی ہے اور تمہیں ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقوے کو ملحوظ رکھا تو بے شک یہ چیز عزیمت کے احوال میں سے ہے" (۱۸۶)

"اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت تو انہوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لے لی، کیا ہی بری ہے

وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی ان کرتوتوں پر مگن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انہوں نے کیے نہیں ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو، ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (۱۸۷-۱۸۹)

۳۷ — الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۵۶) وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ (۱۵۷) وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ (۱۵۸)

'ل' کا مفہوم

'وقالوا لاخوانهم' میں 'ل' اس طرح کا ہے جس طرح کا 'وقال الذین کفروا للذین امنوا لو کان خیرا ما سبقونا الیہ' (اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ نئی دعوت کوئی خیر و برکت والی چیز ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں کر سکتے تھے) میں ہے یعنی بابت اور متعلق کے معنی میں۔ 'اخوان' سے مراد بھائی بند اور تعلق و رشتہ کے لوگ ہیں۔ 'غزّی' غازی کی جمع ہے۔ 'لیجعل' سے پہلے اس کا متعلق محذوف ہے یعنی یہ بات جو ان کے ذہن میں گھسی ہوئی ہے یہ اس لیے گھسی ہوئی ہے کہ ان کی منافقت کی وجہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بدعقیدگی ان کے دلوں میں خار غم بن کر کھٹکتی رہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ ان کی بزدلی کی اصلی وجہ ان کی یہ بدعقیدگی ہے کہ وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بھائی بندوں میں سے کوئی کسی سفر یا جنگ میں مارا جائے تو بڑی

حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس ہوتا یا ہمارے مشورے پر عمل کرتا تو یہ افتاد اس کو پیش نہ آتی۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے جنگ احد کے مقتولوں کے بارے میں بھی کہی۔ حالانکہ موت و زندگی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زندگی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت، جس مقام اور جس شکل میں لکھ رکھی ہے وہ آ کے رہے گی اگرچہ وہ اپنے آپ کو آہنی قلعوں کے اندر بند کر چھوڑے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اس وہم سے ایک دائمی خلش غم اور بزدلی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ اہل ایمان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہ ہمارے ہر عمل کو قدم قدم پر دیکھ رہا ہے۔

مزید حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوا کہ اگر تم کو خدا کی راہ میں شہادت حاصل ہوئی یا کسی اور طرح سے موت آ گئی تو یہ چیز غم کرنے کی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے صلے میں جو مغفرت و رحمت تمہیں حاصل ہوگی وہ ان تمام فانی ذخیروں سے کہیں بہتر ہے جو اس زندگی کے پرستار اپنے لیے جمع کر رہے ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عاید ہو جائے پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت آگے آیات ۱۶۹-۱۷۱ کے تحت آ رہی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ جو مرتا یا قتل ہوتا ہے بہرحال خدا ہی کے پاس پہنچتا ہے تو مومن خدا کے قرب سے کیوں گھبرائے۔ یہی تو قربانی کی حقیقت اور اس کا اصل مدعا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (۱۵۹) إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۶۰)

'فبما رحمۃ' میں زبان کا وہی اسلوب استعمال ہوا ہے جو فبما نقضھم میثاقھم' میں ہے۔ اہل نحو اس طرح کے مواقع میں عموماً 'ما' کو تاکید کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعض مواقع میں یہ محض فقرے کے آہنگ کو ٹھیک رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

'فظ' کے معنی درشت خو اور غلیظ القلب کے معنی سخت دل کے ہیں۔

یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اوپر منافقین پر جو سخت الفاظ میں تنقید ہوئی ہے اس کا اثر نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر اور پھر قدرتی طور پر باحمیت مسلمانوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ آپ کا اور آپ کے مخلص صحابہؓ کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں یہ پسند نہیں فرمایا کہ یہ تبدیلی واقع ہو۔ اگرچہ منافقین کی روش نہایت قابل اعتراض تھی اور وہ حضورؐ کی رافت اور چشم پوشی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن یہ بعض تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہی پسند فرمایا کہ ابھی ان کو اصلاح حال کی مزید مہلت دی جائے تاکہ جن کے اندر ادنیٰ گنجائش بھی اصلاح پذیری کی باقی ہے وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ اسی حکمت کے پیش نظر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ طرز عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و تصویب فرما دی گئی، جو اب تک ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا اور اس کی مصلحت بھی واضح فرما دی گئی کہ یہ منافقین اپنی صحت اور اصلاح کے اتنے قدر داں نہیں ہیں کہ اس کے لئے کوئی تلخ گھونٹ برداشت کر سکیں۔ یہ تو اللہ کی عنایت ہی تھی کہ اس نے تم کو نہایت نرم خو اور حلیم بنایا اور تم نے اسی نرم خوئی اور اسی رافت و شفقت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگر تم ذرا بھی ان کے ساتھ سخت گیری کی روش اختیار کرتے تو یہ ایسے وحشی اور ناقدرے ہیں کہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، اگرچہ دنیا جہان کے روگ ان کے ساتھ چمٹے رہتے۔ تو ان کے ساتھ ابھی اپنی رافت اور رحمت کی یہی روش قائم رکھو۔ ان کی ناقدریوں سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کرتے رہو۔

منافقین کے بارہ میں آنحضرت صلعم کے رویہ کی تصویب

یہ ملحوظ رہے کہ بعد میں جب منافقین کے ایک گروہ نے اپنے رویہ سے بالکل مایوس کر دیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ چشم پوشی کی روش سے یہ لوگ اصلاح قبول کرنے والے

نہیں ہیں تو آخر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اور مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنے رویے کو بدل دیں، اور نرمی سے اگر یہ غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو سختی سے ان کو صحیح راہ پر لائیں۔ اس پر مفصل بحث توبہ کی آیات ۷۳، ۱۲۳ اور تحریم کی آیت ۹ کے تحت آئے گی۔

یہاں عفو اور استغفار کی ہدایت کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی ہوئی کہ 'وشاورھم فی الامر' یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ اس بات کے ذکر کا یہاں ایک خاص موقع ہے جس کو مختصراً سمجھ لینا چاہیئے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم معاملات دین میں کسی کے مشورے کے محتاج نہیں تھے اس لیے کہ آپ ہر کام وحی الٰہی کی رہنمائی میں کرتے تھے لیکن سیاسی و انتظامی معاملات میں آپ اپنے صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح گویا حضورؐ نے خود اپنے طرز عمل سے اس شورائیت کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے سیاسی نظام کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ اسی شورائیت کے پیش نظر آپ نے غزوۂ احد کے موقع پر بھی، جس کے اثرات و نتائج یہاں زیر بحث ہیں، صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے اندر رہ کر کیا جائے یا باہر نکل کر۔ مقصود اس مشورے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ تھا کہ جماعت کے اندر جو کمزور لوگ ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جو کمزور اور منافق قسم کے لوگ تھے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جائے اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی کمزوری اور نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائینگے۔ لیکن مخلصین اور جانثاروں کی رائے اس کے خلاف ہوئی اور یہی رائے صائب اور حضورؐ کی رائے کے مطابق تھی، اس وجہ سے حضورؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا[1]۔ منافقین کو جب اپنا مشورہ منوانے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے مختلف طریقوں سے اپنا غصہ نکالا۔ ایک گروہ تو یہ بہانہ بنا کر عین موقع پر فوج سے الگ ہو گیا کہ اس

[1] تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن پرجوش صحابہؓ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیا یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ آنحضرت صلعم نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اس کے بارے میں خود

کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی۔ دوسرا گروہ جو بادلِ ناخواستہ ساتھ رہا اس نے شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ بددلی پھیلانی شروع کر دی کہ جنگ کا نتیجہ اس وجہ سے نکلا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی۔ اگر ان کی رائے مان لی جاتی تو یہ افتاد پیش نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا مقصود شرارت اور مسلمانوں میں بددلی پھیلانا تھا لیکن اس مرحلے میں مصلحت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھی کہ ان منافقین سے درگزر کی روش اختیار کی جائے اور جو مجلسی اور جماعتی حقوق ان کو حاصل ہیں وہ ان کی ان غلطیوں کے باوجود بھی ابھی باقی رہیں۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ کو ان کے لیے عفو و استغفار کی ہدایت ہوئی اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی کہ جو امور مشورہ کے تحت آتے ہیں ان میں آپ بدستور ان سے مشورہ لیتے رہیں ـــ اگرچہ ان کی کمزوری اور بدخواہی واضح ہو چکی ہے۔

'وشاورھم فی الامر' کے بعد فاذا عزمت فتوکل علی اللہ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انتظامی و سیاسی امور میں مشورے کی یہ ہدایت صاحب امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے پہلو

کے سیاست و انتظامیات کے باب میں صحیح نقطۂ نظر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ- اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی۔ تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکے اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلہ کا جائزہ لینا تھا تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح صحیح حالت کا اندازہ ہو جائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلہ پر اصرار کیا اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرما لیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضورؐ نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ یعنی اب جبکہ عزم ہو چکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔ جب منافقین نے دیکھا کہ ان کی بات نہیں چلی تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کیساتھ الگ ہو گیا۔ یہ واضح رہے کہ آنحضرت صلعم کسی اہم جنگ کے لیے نکلنے سے پہلے فوج کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لئے کوئی حکیمانہ تدبیر ضرور اختیار فرماتے تھے۔ بدر کے موقع پر بھی آپ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی اور اسی موقع پر انصار کے لیڈر نے وہ تقریر کی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

سے ہے۔ مشورہ کرنا تو بہر حال ضروری ہے لیکن مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیئے۔ صاحب امر کے اطمینان کے بعد یہ امر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ جو رائے اس نے اختیار کی وہ اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔ نہ اکثریت فی نفسہٖ دلیل صحت و اصابت ہے نہ اقلیت دلیل خطا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ اصابت کا گمان غالب ہے۔ اس وجہ سے فصل نزاعات میں اگر اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جبکہ اتباع ہوا کا زور ہے اور اختیار و اقتدار کو حدود کے اندر استعمال کرنے والے لوگ کم تر ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عام افراد کی طرح ارباب اقتدار و سیاست کے لیے بھی پسندیدہ روش نرمی و چشم پوشی ہی کی روش ہے۔ اسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اسی طرح اجتماعی نظام میں اصلی چیز نرمی ہے، سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دوسری یہ کہ اجتماعی نظام میں شورائیت اس حسن ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیئے۔ اس سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا دونوں طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے۔

تیسری یہ کہ توکل، بے عملی اور تعطل کا کوئی بہانہ اور گوشہ خمول کا کوئی تکیہ نہیں ہے بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں عزم و عمل کی بنیاد ہے۔

چوتھی یہ کہ اصل قوت توکل علی اللہ ہے۔ وسائل و اسباب کی حیثیت ثانوی ہے۔

پانچویں یہ کہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان کا مدعی ہے اور اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اس کا ایمان بے معنی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۚ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۱) اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۶۲) هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۱۶۳)

غل یغل غلولا کے معنی خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل لفظ 'نصح' کا ضد ہے جس کے معنی خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے 'ماکان لنبی ان یغل' کی تشریح جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، ما کان لنبی ان یخون امتہ کے الفاظ سے کی ہے۔ لفظ غل جو قرآن میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے غش، عداوت، ضغن (کینہ) حقد اور حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے (لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا) اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں آئی۔

لفظ غل کا صحیح مفہوم

یہ منافقین کے الزام کی تردید ہے جو انہوں نے احد کی شکست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کو مسلمانوں کے اندر بد دلی پیدا کرنے کے ارادے سے اچھی طرح پھیلایا۔ الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اس شخص پر اعتماد کیا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اس کو مالک بنایا لیکن یہ اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن انہوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا۔ یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔

منافقین کا الزام اور اس کا جواب

اس الزام کی طرف اوپر کی آیات میں بھی اشارات موجود ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آئے گی۔ قرآن نے یہ ان کے اس الزام کی تردید فرمائی ہے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ کوئی نبی اپنی امت کے ساتھ کبھی بے وفائی و بدعہدی نہیں کرتا۔ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ہر بدعہدی و بے وفائی خدا کے حضور پیش ہو گی۔ اور بدعہد اپنے کیے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔ رضائے الٰہی کے طالب اور اس کے قہر و غضب کے سزاوار یکساں نہیں ہوں گے ان کے درجے

اور ٹھکانے ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ ہوں گے۔ اللہ ہر ایک کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

آیت کی یہ تاویل الفاظ قرآن اور نظم کلام کے مطابق ہے۔ ارباب تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے، جیسا کہ تفسیر ابن جریر سے واضح ہوتا ہے، یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس وجہ سے اس روایت کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے کہ مال غنیمت میں سے ایک چادر گم ہو گئی تھی جس کا الزام منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا تھا اور یہ اس کی تردید ہے۔ اوّل تو یہ روایت بدر کے مال غنیمت سے متعلق بیان کی جاتی ہے (اس لئے کہ اُحد میں مال غنیمت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس میں تو مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی) اور یہاں حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے اُحد کے اس بیچ میں بغیر کسی قرینہ اور بدون کسی حوالہ کے بدر کے کسی واقعہ کا ذکر کرنے کا کیا موقع تھا، جس پر ایک عرصہ گزر چکا تھا؟ پھر سب سے زیادہ خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ منافقین ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا الزام لگائیں جس کو کوئی بھی باور نہ کرے، جو شخص بھی سنے اس کو سن کر ہنس دے۔ منافقین تو درکنار آپ کے کٹر سے کٹر معاندین قریش تک کا یہ حال تھا کہ انہوں نے آپ پر کسی مالی خیانت کا خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کوئی الزام لگانے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ اسلام اور جاہلیت دونوں میں آپ امین کے لقب سے مشہور رہے اور آپ کی اس شہرت کی دھاک جس طرح دوستوں پر تھی اسی طرح دشمنوں پر بھی۔ مالی معاملات پر اگر بعض نادان لوگوں نے حضور کے خلاف کبھی کچھ کہا بھی ہے تو اس کی نوعیت الزام خیانت کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی کے مقابل میں کسی کو کچھ زیادہ دے دینے کی ہے۔ ان مواقع پر بھی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الزام لگانے والے فریق نے سخت ندامت کا اظہار کیا ہے مثلاً فتح مکہ اور غزوہ حنین کے موقع پر۔ اس وجہ سے یہ بات تو بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ منافقین آپ پر ایک حقیر چادر کی خیانت کا الزام لگائیں۔ البتہ یہ بات کہہ کر وہ کمزور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتے تھے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے وفادار اور بہی خواہ نہیں ہیں، وہ اپنے حوصلوں پر اپنی قوم کو قربان کر رہے ہیں۔ احد کی شکست کے بعد اس قسم کے پروپیگنڈے کیلئے انکو موقع ہاتھ آگیا تھا اس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کے مخالف تھے لیکن جانثار صحابہؓ اور نبیؐ نے انکی رائے قبول نہیں کی۔

مقالات
خالد مسعود

زکوٰۃ کا معاشی پہلو

(۵)

زکوٰۃ اگرچہ ایک عبادت ہے اور خدا کی وحی کے تحت واجب ہوئی ہے اور اس اعتبار سے اس کے فوائد اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا کچھ غیر ضروری ہے تاہم بعض امور کا تقاضا یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے بھی کیا جائے۔ مثلاً یہ بات کہ شریعت کے تمام احکام کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم زکوٰۃ کے مصالح اور حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی خصوصیات جو اسے تمام دوسری عبادات سے ممتاز کرتی ہیں یہ ہیں کہ اس میں مالی لین دین ہوتا ہے، بعض لوگ مال ادا کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض اسکو وصول کرنے والے ہوتے ہیں، زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کی مدیں متعین ہیں۔ یہ تمام خصوصیات زکوٰۃ کو خالی عبادت کے دائرے سے نکال کر معاشیات کی حدود میں لے آتی ہیں۔ مزید برآں چونکہ زکوٰۃ کی حیثیت یہ ہے کہ اس کی وصولی کا ذمہ دار اسلامی ریاست کو بنایا گیا ہے، اس لیے اس کے اندر ایک سرکاری محصول کی بھی بعض خصوصیات موجود ہیں۔ یہ تمام باتیں تقاضا کرتی ہیں کہ زکوٰۃ کے نظام کو معاشیات کے اصولوں پر بھی پرکھا جائے۔

زکوٰۃ کے معاشی فوائد

معاشی اعتبار سے سب سے بڑے مسائل جو ہر ملک کو درپیش ہوتے ہیں یہ ہیں کہ عوام کے معیار زندگی کو کیسے بلند کیا جائے اور غربت و افلاس کا خاتمہ کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ ان مسائل کے مقابلہ کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ایک طرف تقسیم دولت مساویانہ ہو اور دوسری طرف عوام کی بہبود کے کاموں کو دوسرے کاموں پر فوقیت دی جائے۔ اسی لیے ایک کامیاب حکومت کے لیے یہ بات لازم سمجھی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سماجی مفادات کو اپنی پالیسیوں میں مدنظر رکھے۔ مشہور معیشت دان ڈالٹن کی رائے ہیں

"سرکاری مالیات کا بہترین نظام وہ ہے جس پر عمل درآمد کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ سماجی فائدے حاصل ہوں"۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر حکومتیں اپنے منصوبے بناتے وقت جس چیز کو رہنما اصول کی حیثیت سے سامنے رکھتی ہیں وہ عوام الناس کی بہبود اور تقسیم دولت کا معقول انتظام ہی ہے۔

چونکہ معاشی ناہمواریاں ایک قوم کی معاشی زندگی میں زیادہ مسائل پیدا کرتی ہیں اس لیے عوام کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے تقسیم دولت کے صحیح انتظام کو اولیت حاصل ہے۔ اس بارے میں ڈالٹن کی رائے ملاحظہ ہو۔ لکھتا ہے۔

"کسی قوم کی معاشی بہبود میں اضافہ کی بڑی شرطیں دو ہیں۔ ایک قوتِ پیداوار میں ترقی اور دوسری تقسیم پیداوار کے طریقوں کی اصلاح۔ قوت پیداوار میں ترقی کے نتیجے میں تو صرف پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے (یعنی فی کس پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے) اور اس کی کیفیت بہتر ہو جاتی ہے مگر تقسیم پیداوار کے طریقوں کی اصلاح کے نتیجے میں مختلف افراد اور خاندانوں کی آمدنیوں کا عظیم تفاوت کم ہو جاتا ہے"۔

معاشی ناہمواری کا سب سے بڑا نقصان جو معاشرے کو پہنچتا ہے وہ اس کی طبقاتی تقسیم ہے، یعنی وہاں معاشرہ دولت کی کمی و بیشی کی بنیاد پر دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ امیر لوگوں کی دنیا عیش و عشرت سے عبارت ہوتی ہے، دنیا کی آسائش ان کو حاصل ہوتی ہے اور دولت و ثروت کے بل بوتے پر وہ ملک کے ذرائع دولت پر قابض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے برعکس غریب طبقہ اتنا پس ماندہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے ضروریات زندگی کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ رات دن کی محنت کے باوجود اتنا کچھ نہیں حاصل کر پاتے جس سے یہ آسودہ حال ہو سکیں۔ اس معاشی تفاوت کے نتیجہ میں بغض و کینہ اور منافرت و منافشت کا پیدا ہو جانا بعید از امکان نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں اشتراکیت کی مقبولیت کے عوامل کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشی توازن کا وعدہ ایک عام آدمی کے لیے سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے اور کمیونسٹوں کے جھنڈے کے نیچے امیر و غریب کی طبقاتی کشمکش جو رنگ لا چکی ہے تاریخ کے صفحات اس کے بیان کے لیے کافی ہیں۔

زکوٰۃ کے نظام کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں تقسیم دولت کا ایک کامیاب

طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں زرعی پیداوار کا پانچواں یا دسواں حصہ جاگیرداروں یا مالکان سے لے کر ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کو حصول رزق کے زیادہ مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اسیطرح اس نظام میں کاروبار کرنے والوں کے ان اموال میں سے جو نشو و نما حاصل کرتے ہیں، محتاجوں کا حصہ ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس تقسیم کے نتیجے میں مالدار طبقہ اپنی دولت کی ایک خاصی مقدار سے دست کش ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی کے پاس دولت جمع ہو جائے تو زکوٰۃ اس کے جمع شدہ مال پر عائد کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں سال بسال اس کے مال کا ایک معتدبہ حصہ غربا میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت امیروں کے کسب مال پر پابندی لگائے بغیر نادار اور فاقہ کش طبقہ کو اٹھانے کی کامیاب کوشش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ کے ساتھ جو نظریات وابستہ ہیں وہ ہر امیر آدمی کو محتاجوں کا ہمدرد، غربا و مساکین کا بہی خواہ اور حرص و آز سے متنفر بناتے ہیں۔ ان کو ماننے والا شخص مال و دولت کی فراوانی کو عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ ادائے حقوق اور غربا پروری کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی محبت ایک خود فریبی اور آخرت کا فائدہ اصل سرخروئی ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کے ساتھ وابستہ ان نظریات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کا امیر طبقہ، غریب طبقہ سے کوئی بُعد محسوس نہیں کرتا اور زکوٰۃ مالدار اور محتاج کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اگر قومی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو زکوٰۃ قومی سرمائے میں اضافہ کا باعث بھی بنتی ہے۔ سرمایہ (CAPITOL) صرف کارخانوں کی مشینری اور بھاری بھرکم ساز و سامان کا نام نہیں بلکہ وسیع معنوں میں اس کی تعریف میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو کسی پہلو سے کوئی قومی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ زکوٰۃ ایک ایسا خرچ ہے جو معاشرہ کے غربا کی خاطر کیا جاتا ہے اور وہی اس سے توانائی حاصل کرتے ہیں لہذا زکوٰۃ کے نظام کے نتیجے میں انسانی سرمایہ تقویت پاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈالٹن کا ایک اقتباس مفید رہے گا۔ لکھتا ہے۔

"اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچت سے سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے مگر صرف دولت سے نہیں ہوتا۔ یہ محض ایک مغالطہ ہے کیونکہ وسیع معنوں میں 'سرمایہ' میں انسان بھی شامل ہیں اور مادی ساز و سامان بھی۔ صرف دولت کے نتیجے میں، خصوصاً جب

یہ غربا کے ہاتھوں اور ان کی خاطر ہو، انسانی سرمایہ کی استعدادِ کار میں اضافہ ہوتا ہے اور بالواسطہ یہ 'سرمائے' میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے"

زکوٰۃ کی رقم معاشرہ کے ان افراد کو دست و بازو عطا کرتی ہے جو اپنے افلاس کے باعث کسی معاشی جدوجہد کے قابل نہیں ہوتے۔ ان کے مضبوط ہونے سے نہ صرف سرمایہ کی استعداد کار میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ خود سرمایہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے ذریعہ سے قومی دولت میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ زکوٰۃ معاشرہ کے جس طبقہ کو فائدہ پہنچاتی ہے یہ وہ طبقہ ہوتا ہے جس کی قوتِ خرید ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ طبقہ اگر بڑی تعداد میں موجود ہو تو ملک کی صنعتی پیداوار کی منڈی محدود ہوتی ہے۔ لوگوں میں اشیاء خریدنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے کارخانہ دار کے مصارفِ پیدائش پورے نہیں ہوتے۔ زکوٰۃ کا نظام نادار طبقہ کو قوتِ خرید مہیا کر کے بالواسطہ ملک کی معاشی ترقی کا باعث بنتا ہے۔

زکوٰۃ وصول کرنے والوں میں سے کتنے ذی ہمت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زکوٰۃ کی رقم کو راس المال کی حیثیت دے کر خود کاروبار کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی محنت اور کوشش کی بدولت افزائش مال کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لیں تو آئندہ کے لیے یہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے یا زکوٰۃ کی مد چلنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ چیز بھی معاشرے کی خوشحالی کا باعث ہے۔

مذکورہ بالا تمام باتیں صرف نظری اعتبار ہی سے درست نہیں ہیں بلکہ فی الواقع زکوٰۃ کے نظام پر عمل درآمد میں اسلامی معاشرے کو یہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں اور تاریخوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے ابتدائی دس بارہ سالوں ہی میں مسلمان معاشرہ کی خوش حالی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگ زکوٰۃ کی واجب الادا رقم لیے پھرتے تھے مگر مدینہ میں اس کا کوئی مستحق نظر نہ آتا تھا۔

زکوٰۃ ایک سرکاری محصول کی حیثیت سے

اوپر کے مباحث میں ہم ان لوگوں کی غلطی واضح کر چکے ہیں جو زکوٰۃ کو اسلامی حکومت کا ایک ٹیکس سمجھتے ہیں۔ زکوٰۃ اپنے مقاصد اور خصوصیات دونوں کے اعتبار سے ٹیکس سے بالکل مختلف چیز ہے البتہ

ایک پہلو سے اسے ایک سرکاری محصول کی حیثیت دی جا سکتی ہے کہ اسلامی ریاست میں زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم کا ذمہ دار حکومت کو ٹھیرایا گیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ زکوٰۃ میں ایک اچھے سرکاری محصول کی کون کون سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

محصول دینے والے کے نقطۂ نظر سے محصول کی جو خصوصیات اہمیت رکھنے والی ہیں وہ یہ ہیں کہ محصول ایسے موقع پر وصول کیا جائے جب اس کا ادا کرنا آسان ہو، اس کے عائد کرنے میں عدل کو ملحوظ رکھا جائے اور تمام لوگوں سے یکساں سلوک کیا جائے اور اس کی شرح یا مقدار دینے والوں پر بالکل واضح ہو ـــــ غور کیا جائے تو یہ تمام خصوصیات زکوٰۃ کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ زکوٰۃ ایک طرف زرعی پیداوار اور اموال تجارت پر عائد ہوتی ہے اور دوسری طرف مالی بچت پر۔ پیداوار اور اموال کے لیے اس کی شرحیں ۱۰ فی صد اور ۲½ فی صد متعین ہیں۔ مال کی مقدار کم ہو یا زیادہ، دونوں صورتوں میں یکساں شرح زکوٰۃ عدل و مساوات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ جہاں تک اس کی وصولی کے مواقع کا تعلق ہے۔ وہ ایسے ہیں کہ زکوٰۃ دینے والا ان مواقع پر زکوٰۃ کا بوجھ کم سے کم محسوس کرتا ہے۔ مثلاً زرعی پیداوار کا دسواں حصہ اس وقت وصول کیا جاتا ہے جب فصل تیار ہو چکتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کسان اپنی سال بھر کی محنت کے ثمرات سے متمتع ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ خدا کی نعمت پا کر داد و دہش پر اپنی طبیعت کو خاص طور پر آمادہ پاتا ہے۔ اس وقت محصلِ زکوٰۃ کی آمد کا بھی وہ دل و جان سے خیر مقدم کرتا ہے۔ اسی طرح مال کی زکوٰۃ چونکہ سالانہ بچتوں پر عائد ہوتی ہے اس لیے اس کی ادائیگی صاحب مال پر مشکل نہیں ہوتی۔ کسی محصول کے ردِّ عمل کا انحصار اس طلب (DEMAND) پر ہوتا ہے جو ایک شخص کے اندر مال کے لیے پائی جائے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کی کمائی میں سے جب کوئی ٹیکس وصول کیا جائے تو وہ اس کو ایک تاوان معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت اپنی ضروریات کے لیے اس کے اندر مال کی طلب بہت زیادہ ہوتی ہے۔ فاضل سرمایہ یا بچت چونکہ اس رقم پر مشتمل ہوتی ہے جو آدمی اپنی اشد ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد پس انداز کر لیتا ہے اس لئے بچت میں سے اگر کوئی محصول وصول کیا جائے تو آدمی اسے آسانی سے ادا کر لیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس وقت آدمی کے اندر مال کی طلب پہلے شخص کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ اس طرح

گویا زکوٰۃ کی وصولی کے لیے صاحب مال کی سہولت کو بھی شریعت نے ملحوظ رکھا ہے۔

اموال کی زکوٰۃ فاضل سرمائے اور بچتوں پر عائد کرنے کے اور بھی کئی فائدے ہیں۔ مثال کے طور پر لوگوں کی جمع مال کی خواہش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روپیہ گردش سے نکل جاتا ہے اور ملک میں تجارتی بحران پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں یا کساد بازاری کی نوبت آتی ہے۔ زکوٰۃ چونکہ جمع شدہ مال سے بھی وصول کی جاتی ہے اس لیے یہ دفینوں کی قیمت کو ہر سال کم کر دیتی ہے۔ صاحب مال دفینے کی مالیت کے گھٹنے کے خوف سے اس کو جمع رکھنے کی بجائے بازار میں لاکر اس سے کاروبار کرنے کو ترجیح دیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ روپیہ دوبارہ گردش میں آکر خود بھی نشو و نما پاتا ہے اور اس کی وجہ سے اور کئی خاندان روزگار پاتے ہیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کا یہ اصول ان ٹیکسوں کی نسبت زیادہ حقیقت پسندانہ ہے جو لوگوں کی آمدنی پر لگائے جاتے ہیں اور جن کو عائد کرتے وقت ان کے اخراجات یا ذمہ داریوں کو کبھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد واحد جس پر کسی دوسرے فرد کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی بڑی فراوانی سے رزق پاتا ہے اور اس کی حقیقی ضروریات کے لیے اس کی کمائی کا ایک چوتھائی حصہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اتنی ہی مقدار میں دولت کما کر کئی خاندانوں کی کفالت کرتا ہے اور ان کے اخراجات کو بمشکل پورا کر پاتا ہے۔ آمدنی پر لگایا ہوا ٹیکس ان دونوں افراد سے یکساں سلوک کریگا اور ایک ہی شرح سے دونوں سے رقم وصول کر لی جائے گی۔ مگر دیکھا جائے تو پہلا شخص اس ٹیکس کا کوئی بوجھ محسوس نہ کرے گا جبکہ دوسرے شخص کی اس سے کمر ٹوٹ جائے گی۔ زکوٰۃ بچتوں پر عائد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مختلف افراد کے اخراجات اور ذمہ داریوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب بچتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے پر ایک اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ جدید معاشیات کی رُو سے بچت (SAVINGS) اور سرمایہ کاری (INVESTMENT) کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ملک میں بچت کا جتنا زیادہ رجحان ہوگا، سرمایہ کاری میں بھی اسی قدر اضافہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں ملک کی معاشی حالت اچھی ہوگی۔ بچتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بچت کی عادت کی ہمت افزائی

نہیں کرتا جس کے نتیجے میں نہ تو سرمایہ کاری کو فروغ ہوگا اور نہ ملک اس کے معاشی فوائد حاصل کر سکے گا۔

یہ اعتراض حقیقت میں اس مفروضے پر مبنی ہے کہ دولت کی طلب لچکدار (ELASTIC) ہے اگر اس پر کوئی محصول عائد کیا جائے تو لوگ اپنے پاس دولت رکھنا چھوڑ دیں گے۔ سرے سے یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ دولت کی طلب لچکدار نہیں ہوتی۔ آج کل حکومتیں آمدنیوں پر بہت بڑی شرح سے ٹیکس عائد کرتی ہیں مگر اس کے باوجود لوگوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں۔ یہی حال بچت کی دولت کا ہے۔ زکوٰۃ کے خوف سے لوگوں کا بچت کرنے پر آمادہ نہ ہونا بالکل خلاف واقعہ ہے۔

مزید برآں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف لوگوں کے سامنے پیسہ جمع کرنے کے مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ رقم اس لیے بچا کر رکھتے ہیں کہ کسی مشکل وقت کا مقابلہ کرنے میں ان کو کوئی دشواری نہ ہو، بعض لوگ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آمدنی ان کی ضروریات کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ خود بچت نہ بھی کریں جب بھی ان کے پاس رقم بچ جاتی ہے، اس میں ان کی کوششوں کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ چونکہ ان تمام لوگوں کی ضروریات اور ذہنی کیفیت الگ الگ ہوتی ہے اس لیے زکوٰۃ کے بارے میں ان کا ردعمل بھی الگ الگ ہوگا۔ مؤخر الذکر دو طرح کے لوگ زکوٰۃ کے باعث اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے کہ وہ بچت کی عادت ترک کر دیں اور زکوٰۃ دینے والوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی عظیم اکثریت انہی دو اقسام کے لوگوں پر مشتمل نظر آئیگی۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ وہ محصول قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا جسکے عائد کرنے کا مقصد سرمائے میں اضافے کی نسبت زیادہ ضروری ہو۔ زکوٰۃ چونکہ حاجتمندوں کی امداد کیلئے ہے اسلئے یہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انسانی سرمایہ کی استعداد کار بڑھانے کا باعث بھی بنتی ہے اور غریب لوگوں کے ہاتھوں سرمایہ کاری کے امکانات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے زکوٰۃ کا مقصد نہایت ہی بلند ہے۔ امیروں کے سرمائے میں اضافوں پر اس مقصد کو لازماً ترجیح حاصل ہونی چاہیئے۔

ان دلائل کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ اسلامی حکومت کا ایک مفید محصول ہے جس میں

تحریک جماعت اسلامی - (۲)

اسرار احمدؒ

نقضِ غزلؒ

(۴)

اس سلسلہ مضامین کے ضمن میں یہ وضاحت پیش نظر رہے کہ اس میں جماعت اسلامی کی تاریخ کے جس اہم مگر مخفی باب اور اس کی "روداد" کے جس ضروری مگر غیر مطبوعہ "حصّے" کو پیش کیا جا رہا ہے — اور خصوصاً واقعات و حوادث کی جو توجیہہ پیش کی جا رہی ہے وہ راقم الحروف کا ذاتی نقطۂ نظر ہے — اسے کسی گروہ یا بہت سے افراد کی متفقہ ترجمانی نہ سمجھا جائے — (اسرار احمدؒ)

مولانا مودودی کا استعفاء از امارت جماعت

اپنے اس خط میں ؂ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جائزہ کمیٹی اور اس کی رپورٹ پر مولانا مودودی کے الزامات کی قلعی کھول لئے اور جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لے کر شوریٰ کے اختتام تک مولانا کے طرز عمل کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ — اس امکان کے پیش نظر کہ عین ممکن ہے کہ مولانا نے شوریٰ میں واقعی صدق دل کے ساتھ 'مصالحت' کی ہو لیکن بعد میں ان پر اس کے نقصانات واضح ہوئے ہوں — جماعت کے دستور کی رُو سے یہ صاف اور سیدھی راہ کھول کر بیان کر دی کہ آپ مجلس شوریٰ کا اجلاس دوبارہ بلائیں اور اس میں اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے رکھ دیں - پھر اگر شوریٰ آپ کے نقطہ نظر کو قبول کرلے تو فبہا، ورنہ آپ شوریٰ کے خلاف اپنا مقدمہ ارکان جماعت کے سامنے پیش کر دیں۔

لہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا ٥ (النحل آیت ۹۲)
اس عورت کے مانند نہ ہو جاؤ جس نے محنت و مشقت سے کاتے ہوئے سوت کو خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔
؂ شائع شدہ "میثاق بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالفرض اجلاسِ شوریٰ کے دوران مولانا مودودی کسی ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا رہے بھی تھے تو اب بہرحال وہ ایک واضح اور متعین لائحہ عمل اختیار کر چکے تھے اور جائزہ کمیٹی کے نام "الزام نامہ" انہوں نے کسی غلطی یا چوک کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مستقل فیصلہ کر کے تحریر کیا تھا ـــــ چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب کا خط ملنے پر انہوں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ منطق اور دلیل ـــ اور قاعدے اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر سیدھی طرح اپنی 'شخصیت' کا زور آزما لیا جائے اور دلائل و براہین کے چھوٹے چھوٹے باٹ چھوڑ کر ایک بار اپنی 'شخصیت' کا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈال کر فیصلہ کر لیا جائے ـــ

اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہ تھی! ـــ تحریکوں اور جماعتوں کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ رفیقوں کے ایثار اور کارکنوں کی محنت و مشقت سے بنی ہوئی 'شخصیتیں' بالآخر اپنی 'شخصیت' ہی کو اپنے قریب ترین رفیقوں کے مقابلے میں "برہانِ قاطع" کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں۔

چنانچہ مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کو ان کے خط کا جواب تو کوئی نہ دیا البتہ یہ کہلوا دیا کہ میں امارت سے مستعفی ہو رہا ہوں اور دوسرے ہی روز اخبارات میں مولانا مودودی کا استعفیٰ از امارت جماعتِ اسلامی ان الفاظ میں شائع ہو گیا[1]

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے مستعفی ہو گئے

مولانا کے استعفیٰ پر غور کرنے کے لئے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا گیا

لاہور - ۱۰ جنوری - جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ

---

[1] اس کی اشاعت کے سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"امیر جماعت کے استعفیٰ کے متعلق جماعت کی مجلس مشاورت نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس کو راز میں رکھا جائے اور شوریٰ کا ہنگامی اجلاس بلا کر صرف اس کے سامنے اس کو پیش کیا جائے لیکن مرکزی سٹاف نے ..... مجلسِ مشاورت کے فیصلے کے خلاف اس کو بڑی دھوم دھام سے اخبارات میں شائع کرایا"

مودودی نے جماعت کے جنرل سیکرٹری کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں وہ جماعت کی امارت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ جماعت کے جنرل سیکرٹری نے ۱۲ر جنوری کو مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا ہے جس میں مولانا کے استعفیٰ پر غور کیا جائے گا۔

"میں جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے استعفیٰ پیش کر رہا ہوں۔ براہ کرم اس کے متعلق ضابطہ کے مطابق کارروائی کریں۔

۱۹۵۵ء میں میری رہائی کے بعد جب مجلس شوریٰ نے مجھے جماعت اسلامی کا امیر منتخب کرنا چاہا تھا میں نے یہ گزارش کی تھی کہ میں اب صرف ایک معمولی رکنِ جماعت کی حیثیت سے خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں ذمہ داری کا منصب سنبھالنے کی اب طاقت نہیں ہے لیکن اس وقت میری معذرت قبول نہ کی گئی اور مجھے امیر منتخب کر لیا گیا۔ پھر نومبر ۱۹۵۶ء میں جب مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تو میں نے استعفیٰ پیش کیا اور یہ بھی گزارش کی کہ وجوہ کو زیر بحث لائے بغیر مجھے سبکدوش کر دیا جائے لیکن افسوس ہے کہ میری یہ درخواست بھی رد کر دی گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا امیر جماعت رہنا جماعت کے لئے مفید ہونے کی بہ نسبت نقصان دہ زیادہ ہے۔ اس لئے میں اس منصب کو چھوڑنے میں ایک لمحہ کی دیر لگانا بھی گناہ سمجھتا ہوں اور یہ بات واضح کئے دیتا ہوں کہ یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیئے پیش نہیں کیا جا رہا ہے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب جماعت میں کوئی منصب بھی حتیٰ کہ مجلسِ شوریٰ کی رکنیت بھی قبول نہ کروں گا۔ میں جماعت کے نصب العین اور نظام کی جو کچھ بھی خدمت کر سکتا ہوں اب صرف ایک رکن جماعت کی حیثیت سے کر سکتا ہوں۔

الحمد للہ کہ جماعت اسلامی کے ساتھ میرا تعلق نہ محض ضابطہ کا ہے اور نہ کسی منصب پر موقوف ہے یہ ایک گہرا قلبی و روحانی رشتہ ہے جو کسی حال میں ٹوٹ نہیں سکتا اور جماعت کا مقصد میرا اپنا مقصد زندگی ہے۔ جس کی خاطر ہی میرا مرنا اور جینا ہے۔ اس لئے میری خدمات جماعت کے لئے جس طرح آج تک وقف رہی ہیں اسی طرح انشاء اللہ ہمیشہ وقف رہیں گی اور جو بھی امیر جماعت ہوگا اس کا خیر خواہ اور اس کی اطاعت فی المعروف کا پابند رہوں گا۔ میں اس بات سے

خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کی تعمیر کے لئے میں نے آج تک جان کھپائی ہے اب میں ہی اس میں کسی خرابی کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنوں۔

امارت کا منصب چھوڑتے ہوئے میں جماعت کو دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرے رفقاء میرے ان مشوروں کو جو خالص خیر خواہی کی بنا پر میں عرض کر رہا ہوں قبول فرمائینگے۔ میری پہلی نصیحت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جماعت کی بھلائی چاہتا ہے میرے استعفےٰ کے وجوہ کو زیر بحث لانے سے کلّی اجتناب کرے اور اخبارات میں یا محفلوں اور مجلسوں میں اس کے متعلق چاہے کیسی ہی قیاس آرائیاں اور رائے زنیاں ہوں ان کو صبر و سکوت کے ساتھ ٹال دے۔ اس بحث میں بھلائی اگر کچھ ہو بھی تو وہ برائی کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ دوسری نصیحت میں یہ کرتا ہوں کہ امارت کا نیا انتظام بالکل اسی طرح کیا جائے جسطرح ایک امیر جماعت کے اچانک مر جانے پر کیا جانا چاہیئے۔ کوئی بحث جو اس سے پہلے پیدا ہوئی ہو، نہ تازہ کی جائے اور نہ اس کا پس منظر ہی پیش نظر رکھا جائے بالکل نئے سرے سے کام کا آغاز کرنے ہی میں جماعت کی بھلائی ہے۔

میں تمام رفقائے جماعت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے بر دورِ امارت میں نہایت اخلاص و محبت اور پورے اعتماد کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزائے خیر دے اس کے ساتھ میں ان تمام رفقاء سے معافی بھی چاہتا ہوں جنہیں پچھلے پندرہ سال میں کبھی مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ خصوصیت کے ساتھ حال میں مجلس شوریٰ کے جن ارکان کے بارے میں میں نے ایک کارروائی کی تھی۔ مجھے احساس ہے کہ انہیں اس سے ضرور اذیت پہنچی ہوگی۔ ایک شخص جو کسی ذمہ داری کے منصب پر ہو اسے کبھی نہ کبھی اپنے ذاتی تعلقات کو نظر انداز کر کے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایسے کام کرنے پڑ جاتے ہیں جن سے اس کے دوستوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری امارت کے ساتھ اس معاملہ کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس کی یاد بھی ذہن میں نہ رکھی جائے۔ میں اپنے ان رفقاء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کے متعلق ہر شکایت دل سے نکال دیں اور مجھے معاف کر دیں۔

(ماخوذ از روزنامہ کوہستان مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۷ء)

ہنگامے اس استعفے کی اشاعت سے ایک طرف تو یہ فطری ردِّ عمل ظاہر ہوا کہ جماعت اسلامی کے ارکان، متفقین، ہمدردوں اور متاثرین کے حلقے میں ایک انتہائی جذباتی اور ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ قریب کے شہروں سے جماعت کے لوگوں کے وفود مرکز جماعت میں آنے شروع ہوگئے اور دور دراز کے علاقوں سے تاروں کا تانتا بندھ گیا ـــــ اور پوری جماعت میں پریشانی اور فکرمندی کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ

> اور اس طرح ایک ایسی فضا تیار ہوگئی جس میں صحیح کیا ہے اور غلط کیا کے فیصلے سے زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز ہوگئی کہ کسی طرح مولانا مودودی کو استعفےٰ واپس لینے پر آمادہ کیا جائے !!

اور دوسری طرف مولانا کے فعّال نائبین نے ارکانِ جائزہ کمیٹی اور ان کے ہم خیال اراکینِ شوریٰ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ لاہور، لائلپور اور راولپنڈی اس مہم کے اہم مورچے تھے، لاہور میں اس مہم کے کمان دار جناب نعیم صدیقی تھے۔ لائلپور میں جناب اسعد گیلانی اور راولپنڈی میں جناب صدیق الحسن گیلانی۔ یہ مہم جس طور سے چلائی گئی اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہوسکتا ہے کہ لاہور میں ارکان جماعت کے ایک اجتماع میں جب نعیم صدیقی صاحب نے جائزہ کمیٹی اور اور شوریٰ کے "رجعت پسند" ارکان کے خلاف دھواں دھار تقریر کی اور ان پر شدید قسم کے ذاتی حملے کئے اور جماعت کے کچھ ارکان نے انہیں ٹوکا کہ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں اس طرح کے الزامات لگانا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے تو . . . . ملک نصراللہ خاں عزیز صاحب نے طنز اور تمسخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمایا کہ ـــ "جی ہاں! آپ جس تقویٰ کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کچھ غنڈے کسی شریف اور پردہ دار گھرانے میں گھس کر عورتوں کی عزت و ناموس پر حملہ کر رہے ہوں اور باہر کچھ متقی حضرات داخلے کے اذن کے انتظار میں کھڑے رہ جائیں۔ آ ـــــ یعنی عام ارکانِ جماعت کے سامنے ان حضرات نے صورتِ حال کا جو نقشہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ مولانا مودودی جو اس تحریک کے موسس اور داعی اول بھی ہیں اور از یوم تاسیس تا امروز اس کی قیادت بھی کرتے رہے ہیں۔ آج ایک انتہائی مظلومانہ صورتِ حال سے دوچار ہیں اور جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے کچھ لوگوں نے مل کر ان پر ایسا ستم توڑا ہے کہ وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں امارتِ جماعت کے منصب سے مستعفی

ہونے پر مجبور ہو گئے!

پروپیگنڈے کی اس انتہائی افسوسناک مہم کے ساتھ ساتھ ــــ بعض 'امرائے حلقہ' نے اپنے اختیارات کا 'بھرپور' استعمال بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ جناب امیر حلقہ لائلپور نے مرکزی مجلس شوریٰ کے دو اراکین یعنی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور چوہدری عبدالحمید صاحب کی رکنیت جماعت ہی کو معطل کر دیا ــــ اسی قسم کی کارروائی جناب سعید ملک صاحب کے ساتھ بھی ہونے والی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے پیشگی وار کر دیا اور ایک باقاعدہ پریس کانفرنس بلا کر اس میں جماعت سے اپنے استعفے کا اعلان کر دیا ــــ اور ساتھ ہی جماعت کی قیادت پر بہت سنگین قسم کے الزامات عائد کئے ــــ مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی روایتی شرافت کا ثبوت دیا اور وہ کچھ کہے سنے بغیر خاموشی کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے!

جناب قیم جماعت، میاں طفیل محمد صاحب نے مولانا کے استعفے پر غور کرنے کے لئے مرکزی مجلس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس طلب فرمایا تو اس میں ایک 'خصوصی احتیاط' یہ برتی کہ چونکہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس وقت اتفاقاً کسی ٹیکنیکل رکاوٹ کی بنا پر شوریٰ کے باقاعدہ رکن نہ تھے، لہٰذا انہیں شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہ دی ــــ (حالانکہ اس سے قبل شوریٰ کے پندرہ روزہ اجلاس میں مولانا شریک رہے تھے) ــــ ادھر لائلپور سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے فون پر دریافت کیا کہ "میرے پاس بیک وقت دو 'حکمنامے' پہنچے ہیں۔ ایک آپ کا جس میں آپ نے شوریٰ میں شرکت کے لیے طلب فرمایا ہے اور دوسرا جناب امیر حلقہ کا جس میں میری رکنیت جماعت ہی معطل کر دی گئی ہے! ــــ تو فرمائیں کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟" ــــ تو جواباً ارشاد فرمایا کہ "آپ لاہور چلے آیئے، شوریٰ کے پہلے اجلاس میں یہ مسئلہ طے کر لیا جائے گا کہ آپ شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں!" ــــ اور جب حکیم صاحب نے مزید اصرار کیا کہ انہیں لاہور پہنچنے اور پھر شوریٰ میں شریک ہوئے بغیر لوٹنے کی ذلت سے بچا لیا جائے تو ارشاد ہوا کہ: "گھبرایئے نہیں! آپ کو آمد و رفت کا کرایہ دے دیا جائے گا ــــ!" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!!

شوریٰ کی قرار دادِ اعتماد

ان حالات میں مرکزی مجلسِ شوریٰ کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے معزز اراکین اس کے سوا اور کیا سوچ سکتے

تھے کہ جیسے بھی ہو پہلے رُوٹھے ہوئے امیر کو منایا جاتے۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ چنانچہ شوریٰ نے مولانا مودودی صاحب پر اعتماد کی قرار داد پاس کی اور ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی۔ روزنامہ "کوہستان" لاہور کی ۱۳ر جنوری کی اشاعت کی خبر ملاحظہ ہو۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے استعفٰے واپس لینے کی درخواست

جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کی قرارداد

لاہور - ۱۲ر جنوری - مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک خاص اجلاس آج صبح ۱۱ بجے جماعت کے مرکزی دفتر میں چوہدری غلام محمد امیر حلقہ کراچی کی صدارت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے جماعت کی امارت سے استعفیٰ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا اور حسب ذیل قرارداد بالاتفاق رائے پاس کی۔

" اس وقت جماعت اسلامی جن غیر معمولی حالات سے دوچار ہے ان کے ہوتے ہوئے امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا منصب امارت سے اچانک مستعفی ہو جانا مجلس شوریٰ کی نگاہ میں ایک عظیم سانحہ ہے۔ درحقیقت جماعت، موصوف کی رہنمائی کی جتنی محتاج اس وقت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعفٰے نے جماعت کو ایک شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مجلس شوریٰ اس موقع پر پوری جماعت کی نمائندگی کرتے ہوئے بالاتفاق مولانا مودودی کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا کی پندرہ برس کی خدمات اور قربانیوں کے پیش نظر ان کے ہوتے ہوئے امارت کے منصب کے لیے جماعت اسلامی کی نگاہ کسی اور طرف اٹھ ہی نہیں سکتی اور نہ کوئی دوسری شخصیت اس تحریک کو اتنی خوش اسلوبی سے چلا سکتی ہے جس کی مثال جماعت کے داعی اول نے قائم کی ہے۔ عمر، صحت اور کسی ایسے غیر اختیاری تقاضے کے تحت خدانخواستہ اگر کبھی مولانا کو اس بار گراں سے سبکدوش ہونا پڑے تو وہ بالکل دوسری صورت ہوگی اور ایسے عالم معذوری میں جماعت ان کے اوپر ظلم کرنا کبھی پسند نہ کرے گی لیکن اس وقت خدا کے فضل سے مجلس شوریٰ کے نزدیک ایسی صورت نہیں ہے۔

بنابریں مجلس شوریٰ متفقہ طور پر امیر محترم سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جماعت

سے ان کی جو والہانہ محبت ہے، اسے پوری طرح بروئے کار لاکر موصوف اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ مجلسِ شوریٰ یہ یقین دلاتی ہے کہ نہ صرف اس مجلس کے اعضاء بلکہ عام ارکان جماعت حسبِ سابق پوری طرح خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ اطاعت و تعاون کرتے رہینگے۔

مجلسِ شوریٰ مولانا عبدالغفار حسن، شیخ سلطان احمد، چوہدری غلام محمد، ملک نصراللہ خاں عزیز، مولانا عبدالحق، خان سردار علی خاں اور خان محمد باقر خاں پر مشتمل ایک وفد کو مامور کرتی ہے کہ وہ اس قرارداد کو مجلس کی طرف سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کرے اور ان پر زور ڈالے کہ وہ مجلس کی اس مخلصانہ اپیل کو کسی صورت بھی مسترد نہ فرمائیں۔"

اس کے ساتھ ہی اخبار مذکور نے جو یہ 'خبریں' بھی شائع کیں کہ :

" آج مرکزی مجلسِ شوریٰ اور اس کے معتمد کے نام متعدد مقامات سے اس مضمون کے تار موصول ہوئے کہ شوریٰ کو چاہیئے کہ مولانا مودودی کا استعفیٰ ہرگز ہرگز قبول نہ کرے اور اپنی پہلی ہی نشست میں اس کی نامنظوری کا اعلان کر دے۔

کل کی طرح آج بھی مرکز میں صبح سے شام تک لاہور اور باہر کے مختلف مقامات سے لوگ آتے رہے۔ اکثر حضرات جو باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ کل سے یہیں پر مقیم ہیں۔ راولپنڈی اور اوکاڑہ سے مزید لوگ پہنچے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ، بہاول پور اور کراچی سے بھی لوگ یہاں آئے۔ آج کی ڈاک میں تار اور ٹیلیفون کے ذریعے مختلف مقامات کی پر پاس شدہ قراردادیں بھی موصول ہوئیں۔

تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد جماعت کے مرکزی سٹاف ہی کا فراہم کردہ تھا! اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت نے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند سالوں میں 'مطالبہ' کا جو خصوصی تکنیک ایجاد کیا تھا اور جس کی اس کے کارکنوں کو خاصی مشق ہو چکی تھی کس طرح خود اس کے اندرونی معاملات میں وہ پورا تکنیک ہو بہو استعمال ہوا ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس کے علاوہ ... اسی شوریٰ نے یہ بھی طے کیا کہ جلد از جلد ارکانِ جماعت کا ایک

کل پاکستان اجتماع عام منعقد کیا جائے ۔ جس میں جماعت کی آئندہ پالیسی اور امیر جماعت کے استعفیٰ کے وجوہ وغیرہ پر غور کیا جائے ۔[۱]

استعفے کی واپسی شوریٰ کی قرارداد کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے جو خط شوریٰ کو لکھا اس کا متن حسب ذیل ہے (ماخوذ از روزنامہ 'نوائے وقت' اشاعت ۱۴؍جنوری ۵۷ء)

" آپ کی قرارداد اور ارکان و متفقین جماعت کی عام خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں عارضی طور پر اپنا استعفاء کل پاکستان اجتماع ارکان کے انعقاد تک کے لیئے واپس لیتا ہوں ۔ میں انشاء اللہ اجتماع کے موقع پر تمام رفقاء کے سامنے اپنی وہ مشکلات رکھ دوں گا ۔ جن کی بنا پر میں اپنے آپ کو فرائض امارت کی انجام دہی کے قابل نہیں پاتا ہوں اور وہ مصالح اور ضروریات بھی بیان کر دوں گا ، جن کے لحاظ سے میرا اس منصب پر رہنا مناسب نہیں ہے ۔ ان سارے پہلوؤں کی وضاحت ہو جانے کے بعد ارکان جماعت جو رائے بھی قائم کرینگے وہ انشاء اللہ میری انفرادی رائے سے بہتر ہو گی ۔ چونکہ مجھے دستور جماعت کی رو سے ایسی حالت میں اپنا قائم مقام مقرر کرنے کا حق ہے جبکہ میں فرائضِ امارت انجام نہ دے سکوں اس لیئے میں چودھری غلام محمد صاحب کو قائم مقام امیر مقرر کرتا ہوں ۔"

اسطرح وہ استعفیٰ جو اس "وضاحت" کے ساتھ دیا گیا تھا کہ " یہ بات واضح کئے دیتا ہوں کہ یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے پیش نہیں کیا جا رہا ــ" تین دن کے اندر اندر واپس ہو گیا ــــ اگرچہ واپسی اس احتیاط کے ساتھ ہوئی کہ استعفے کی سیفِ قاطع جس نے سرکش شوریٰ کو " اطاعت و تعاون " پر مجبور کیا تھا ارکانِ جماعت کے اجتماع عام کے سر پر بھی لٹکتی رہے !

مولانا امین احسن اصلاحی کا استعفیٰ از رکنیت جماعت مرکز جماعت اسلامی میں پیش آنے والے ان تمام ڈرامائی واقعات کی خبریں مولانا امین احسن اصلاحی

---

[۱] ص ۵۴ پر دیکھیے

صاحب اپنی رہائش گاہ پر مقیم ایسی بے بسی کے ساتھ سنتے رہے جیسے وہ وہاں 'نظربند' ہوں ؎

روداد چمن اسطرح سے سنتا ہوں قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا!

اور اسی بے چارگی اور دل شکستگی کے عالم میں انہوں نے جماعتِ اسلامی کی رکنیت سے استعفٰے دے دیا۔[1]

اسطرح ایک مرتبہ یہ معاملہ اپنی 'منطقی انتہا' کو پہنچ گیا ـــــ اور مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی سولہ سالہ رفاقت ختم ہوگئی ـــــ اور اگرچہ کچھ مخلصین کی مصالحانہ مساعی اور ذمہ دار لوگوں کی یقین دہانیوں کی بنا پر مولانا اصلاحی صاحب نے اپنا استعفٰے واپس لے لیا

---

[1] مولانا کے اپنے الفاظ میں :-

"شوریٰ کا یہ اجلاس ایک بالکل ہنگامی اجلاس تھا۔ یہ شوریٰ صرف امیر جماعت کے استعفٰے سے پیدا شدہ صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے فوری طور پر بلائی گئی تھی اس کے لئے کوئی ایجنڈا نہ تھا۔ اس کے بعض ارکان کے ساتھ یہ معاملہ بھی پیش آیا کہ ادھر مرکز سے ان کو شوریٰ کی شرکت کی دعوت نامے ملے لیکن جب وہ گھروں سے روانہ ہونے لگے تو ادھر حلقہ سے ان کو یہ اطلاع ملی کہ وہ جماعت کی رکنیت سے معطل کر دیئے گئے۔ یہ شوریٰ جماعت کی پالیسی وغیرہ کے مسائل پر کوئی فیصلہ دینے کی مجاز نہ تھی۔ لیکن اس نے صرف امیر جماعت پر اظہارِ اعتماد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امیر جماعت کو خوش کرنے کے لیے اس نے پالیسی کے معاملہ میں بھی مداخلت کی۔ مجھے اس شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس وجہ سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس کے اندر جاکر اس کی خلافِ دستور کارروائیوں پر ٹوک سکتا لیکن میں نے اس کے دوران انعقاد ہی میں اس کے سامنے جماعت کی رکنیت سے اپنا استعفٰے پیش کر دیا، کیونکہ میں امیر جماعت پر اس کے غیر مشروط اظہارِ اعتماد کو ان تمام اقدامات کی تصدیق کے ہم معنی سمجھتا تھا جو امیر جماعت نے جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف کئے تھے"

اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ مولانا جماعت کے رکن رہے ـــــ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل مسلّم ہے کہ جہاں تک جماعت کے ان دو چوٹی کے قائدین کا تعلق ہے ان کے مابین اعتماد اور اتفاق کی کیفیت پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

جن لوگوں کو مولانا اصلاحی صاحب کی شخصیت کے قریبی مطالعے کا موقع نہیں ملا ہے ان کے لیے یہ بات واقعتہً بالکل ناقابل فہم ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں وہ انتہائی رائے قائم کر چکنے کے بعد جو مولانا اصلاحی صاحب کے خط سے ظاہر ہوتی ہے ـــــ اور اب مولانا کے اس رویّے کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد کہ وہ ہر فیصلہ اپنی 'شخصیت' کی 'برہانِ قاطع' کے بل پر کرنے پر تل گئے ہیں ـــــ وہ آخر کس امید میں مصالحت کنندگان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

> واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی طبیعت کی ظاہری سختی اور مزاج کی ظاہری درشتی کے پردوں میں ایک انتہائی صلح جو اور آخری حد تک آمادۂ مصالحت شخصیت چھپی ہوئی ہے اور وہ کسی کام کو شروع کر لینے کے بعد اس کو جاری رکھنے کے لیے آخری حد تک مصالحت (COMPROMISE) کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چاہے اس سے ان کی ذات کتنی ہی مجروح ہو اور ان کی پوزیشن کتنی ہی خراب ہو جائے ـــــ!

یہی وجہ ہے کہ مولانا اس وقت تک مصالحانہ مساعی کے ساتھ تعاون کرتے رہے جب تک خود مصالحت کنندگان تھک ہار کر نہ بیٹھ رہے اور اسی بنا پر ان کے بعد کے رویّے میں منطقی ربط نظر نہیں آتا اور مستقبل کے مؤرخ کے لیے یہ حق باقی رہ جاتا ہے کہ چاہے تو ان کے طرزِ عمل کو انتہائی دردمندانہ اور مخلصانہ صلح جوئی کا نتیجہ قرار دے اور چاہے تو مکر و ریا پر محمول کر لے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے استعفے کے واپسی کی توجیہہ یہ بیان فرمائی ہے۔

"میرے استعفےٰ کے بعد چودھری غلام محمد صاحب (جو قائم مقام امیر جماعت بنائے گئے تھے محمد باقر خاں صاحب کے ساتھ مجھ سے ملے اور مجھے یہ اطمینان دلایا کہ امیر جماعت پر اظہار اعتماد ہرگز ان کے ان اقدامات کی توثیق کے ہم معنی نہیں ہے جو انہوں نے شوریٰ سے

کے فیصلہ اور جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف کئے ہیں انہوں نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہا کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف امیر جماعت نے جو اقدام کیا ہے وہ اسکو نہ صرف واپس لینگے بلکہ ان سے معافی بھی مانگینگے انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ قائم ہے - دسمبر کی شوریٰ کی قرارداد بھی قائم ہے - البتہ اجتماع عام کے انعقاد تک لوگوں کو پالیسی کے معاملہ میں کوئی بحث و نزاع برپا کرنے سے روک دیا گیا ہے - انہوں نے یہ باتیں اس قدر گہرے تاثر اور اس قدر وثوق و اعتماد کے ساتھ کہیں کہ مجھے اپنا استعفےٰ واپس لے لینا پڑا -"

یہاں فوری طور پر جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ـــــ کیا مولانا اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ 'جماعت اسلامی' میں اصل مؤثر اور فیصلہ کن شخصیت مولانا مودودی کی تھی ؛ ـــــ ذہن اسے قبول نہیں کرتا - اس لئے کہ جماعت کی مخصوص تنظیمی ہیئت میں جو مقام مولانا مودودی کو حاصل تھا اس سے سب سے زیادہ واقف خود مولانا امین احسن صاحب تھے ـــــ ! تو پھر سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ جس شخصیت نے اپنی مقبولیت کی دلیل کے آگے خود مولانا اصلاحی صاحب کو بے بس کر دیا تھا - اس کے سامنے اپنے پورے سوز اور سارے اخلاص کے باوجود یہ غریب یقین دلانے والے کیا حیثیت رکھتے تھے ! ـــــ چنانچہ مندرجہ بالا تصریحات کے مابعد جب مولانا اصلاحی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ـــــ

" ان وعدوں میں سے یہ حضرات کسی ایک وعدے میں بھی سچے ثابت نہیں ہوئے"[1]

تو محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا بالکل فطری تھا ـــــ البتہ مولانا کا ان حضرات کی یقین دہانیوں کی بنیاد پر خیر کی امیدیں وابستہ کر لینا زیادہ سے زیادہ نیک خواہشات کی کارفرمائی قرار دیا جا سکتا ہے !!

حالات جو رخ اختیار کر چکے تھے ـــ اور نوبت جہاں تک پہنچ گئی تھی اس کے لحاظ سے اب مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال ارکان شوریٰ اور دیگر اصحاب رائے کے لیے دو ہی راہیں عقلاً صحیح تھیں۔

---

[1] یہ تمام اقتباسات مولانا اصلاحی صاحب کے اس سائیکلو سٹائل شدہ وضاحتی خط سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد لوگوں کے استفسارات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا !

ایک یہ کہ ـــــ اگر ان کے نزدیک مولانا مودودی کی ذات سے قطع نظر ـــ اب بھی مجموعی اعتبار سے جماعت اسلامی میں شر پر خیر غالب تھا تو وہ خاموشی سے جماعت سے علیحدہ ہو جاتے اور وہ طرز عمل اختیار کرتے جو اس سے قبل مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا تھا ـــــ اور جو اس موقع پر بھی مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے اختیار کیا ـــ اس صورت میں آئندہ کے لیے صحیح لائحہ عمل یہ ہوتا کہ 'اقامتِ دین' کی ہمہ گیر جدوجہد کی طرف سے صبر کا گھونٹ پی کر دین کی کسی 'جزوی خدمت' میں اپنے آپ کو کھپا دیا جاتا ـــــ اور جماعت کو فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا - اس لیے کہ اس صورت میں جماعت سے علیحدہ ہو کر بھی اس پر تنقید کرنے کا حق انہیں نہ ہوتا اور جماعت کے عام ارکان کی یہ حجّت ان پر قائم ہو جاتی کہ آپ حضرات نے جماعت کے اندر اپنے اختلافِ رائے کا اظہار کیوں نہ کیا ـــــ ! (الّا یہ کہ بعد میں کسی مرحلے پر یہ محسوس کیا جاتا کہ جماعت کسی صریح دینی فتنے میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس کا ابطال ایک 'دینی فریضہ' بن گیا ہے !)

دوسری یہ کہ ـــــ اگر ان کی رائے میں مولانا مودودی کی غلط رہنمائی اور ان کے غلط اقدامات کی بنا پر جماعت میں خیر پر شر غالب آ چکا تھا یا آنا لازمی تھا ـــ تو پھر ایک ہی طرز عمل صحیح تھا، اور وہ یہ کہ جماعت میں کھل کر اختلاف رائے کا اظہار کیا جاتا اور ڈٹ کر مولانا مودودی کی مخالفت اور ان کے غلط اقدامات کی مذمّت کی جاتی - متذکرہ بالا رائے قائم ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ عقلاً صرف یہی طرز عمل صحیح تھا بلکہ جماعت کا دستور اور وہ 'جمہوریت' اور 'شورائیت' بھی اسی کے متقاضی تھے جن کے پودوں کو خود مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا ـــ اور جماعت کے عام ارکان کے 'حق نصح' کی ادائیگی کی واحد صورت بھی یہی تھی ـــــ ـــــ اس طرز عمل سے بدترین نتیجہ جو نکل سکتا تھا وہ یہ کہ جماعت بالکل منتشر ہو جاتی تو ایک ایسی جمعیّت کا منتشر ہو جانا جس میں شر غالب آ چکا ہو، بجائے خود ایک خیر ہے ! ـــــ ایک بعید امکان اس کا تھا کہ مولانا مودودی مُتّہم (DISCREDIT) ہو جاتے اور جماعت کی رہنمائی کی ذمہ داری کسی اور کو سنبھالنا پڑتی تو یہ جماعتی زندگی کے لوازم میں سے ہے اور اس سے پہلو بچانا کسی کے لیے جائز نہیں ! ـــــ ایک امکان یہ تھا کہ جماعت تقسیم ہو جاتی تو اس میں

بھی کوئی حرج نہ تھا۔ ہر حصہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق 'اقامتِ دین' کی ہمہ گیر جدوجہد میں مشغول ہو جاتا ـــــ بدرجۂ آخر یہ کہ اہلِ اختلاف ذلیل کر کے نکال دیئے جاتے تو اس صورت میں بھی کم از کم یہ تو ہو جاتا کہ ان کی جانب سے پوری جماعت پر اتمامِ حجت ہو جاتا ـــــ اور جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی انہیں اس کی پالیسی پر تنقید کا حق بجا طور پر حاصل رہتا۔

بدقسمتی سے عملاً جو کچھ ہوا وہ یہ کہ مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ نے نہ پہلی راہ اختیار کی نہ دوسری! ـــــ بلکہ کچھ مخلص مصالحت کنندگان کے زیرِ اثر یہ حضرات ایک ایسی "نیمے دروں نیمے بروں" پالیسی پر عمل پیرا ہو گئے جس سے عام ارکانِ جماعت پر 'اتمامِ حجت' تو کیا ہوتا ان کا 'حقِ نصح' بھی ادا نہ ہو سکا ـــــ بلکہ ان حضرات کی اپنی پوزیشن اکثر ارکانِ جماعت کے لیے ناقابلِ فہم ـــــ اور بعض حالات میں مضحکہ خیز تک ہوتی چلی گئی ـــــ!! یہ ہے وہ 'مصالح' جن کے پیشِ نظر یہ 'درمیانی راہ' اختیار کی گئی تھی تو ان کی پوری فصل مولانا مودودی نے کاٹ لی ـــــ!!!

مصالحت

اس مرتبہ مصالحت کنندگان میں سرِ فہرست اگرچہ چوہدری غلام محمد صاحب (قائم مقام امیرِ جماعت) اور جناب محمد باقر خاں صاحب مرحوم تھے اور ابتداءً شیخ سلطان احمد صاحب نے بھی مصالحانہ کوششوں میں ... حصہ لیا ـ لیکن اس سلسلے میں فیصلہ کن مساعی تحریکِ مسلم لیگ کے ایک پرانے سرگرم کارکن جناب ظفر احمد انصاری صاحب کی ثابت ہوئیں جنہوں نے گفت و شنید اور مذاکرات (NEGOTIATIONS) کے خداداد ملکہ سے کام لے کر مولانا اصلاحی صاحب کو چند ایسے وعدوں (COMMITMENTS) کا پابند کر لیا ـــــ جو مولانا کی ذاتی شرافت اور مروت کی بنا پر آئندہ کے لئے ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے!

'مصالحت' کے فلسفے کا بنیادی پتھر یہ تھا کہ ـــــ جماعتِ اسلامی کے عام ارکان کی تربیت اس طرز پر نہیں ہوئی ہے کہ وہ پالیسی اور طریقِ کار کی دقیق بحثوں میں سکون، اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اپنے اکابر کے باہمی اختلافات (قطع نظر اس سے کہ وہ نجی نوعیت کے ہوں یا جماعت کی پالیسی سے متعلق) پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں، لہٰذا

اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی متبادل پروگرام لے کر ایک دوسرے کے بالمقابل جماعت کے عام ارکان کے سامنے پیش ہوئے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا کہ جماعت بالکل منتشر ہو جائے گی اور اقامت دین کے لیے کی گئی ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے گی ——! مولانا مودودی کے انتہائی اقدامات (ارکان جائزہ کمیٹی پر الزامات اور پھر استعفٰی از امارتِ جماعت وغیرہ) کے بارے میں غالباً یہ رائے قائم کی گئی کہ یہ سب کچھ محض جذبات میں ہو گیا ہے اور بالکل غلط ہے۔ تاہم جماعت کی مصلحت اسی میں ہے کہ مولانا مودودی کو زیادہ مُتّہم (DISCREDIT) نہ کیا جائے —— جماعت کے حالات کی اصلاح اور اس کے آئندہ رُخ کی تبدیلی کے بارے میں غالباً یہ طے ہوا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ اور رفتہ رفتہ ہو[1] اور سردست صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ ایک تو اس ہنگامی دَور کے انتہائی اقدامات کو کالعدم قرار دیا جائے اور دوسرے جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں ارکان جماعت کے سامنے اس مرتبہ پھر شورٰے کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد پیش کی جائے۔

چنانچہ جن ارکان کی رکنیت معطل کی گئی تھی وہ بحال کر دی گئی (جناب عبد الجبار غازی صاحب اور سعید ملک صاحب چونکہ از خود مستعفی ہوئے تھے لہٰذا ان کا معاملہ جُدا تھا) اور ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان سے متصلاً قبل اسی مقام پر مرکزی مجلسِ شورٰے کا ایک اجلاس اس غرض سے طلب کر لیا گیا کہ اس میں جماعت کی آئندہ پالیسی سے متعلق کوئی ایسا مصالحتی فارمولا تیار

[1] غالباً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو ابھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا مودودی جماعت میں اپنی مقبولیت کے نشے میں "جمہوریت" اور "شورائیت" کی اس برائے نام بساط کو بھی بالکل لپیٹ دیں گے جو ابھی کم از کم جماعت کے دستور میں قائم تھی —— اور "مجلس عاملہ" کا ایک نیا ادارہ (INSTITUTION) قائم کر کے مجلسِ شورٰے کو ایک بالکل غیر مؤثر اور محض علامتی ادارہ بنا دیں گے —— جس سے جماعت میں "اربابِ حل وعقد" کا جو تصور اس وقت تک قائم تھا بالکل بدل جائے گا —— اور مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہمخیال ارکینِ شورٰی مع جمیع مصالحت کنندگان کے ایک انتہائی غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائیں گے ——!!

(EVOLVE) کرلیا جائے جسے عام ارکانِ جماعت کے سامنے شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

راقم الحروف کا موقف

راقم الحروف تک جب یہ اطلاع پہنچی کہ جماعت کے 'اوپر کے حلقے' میں پھر 'مصالحت' کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس امر کا امکان ہے کہ ارکانِ جماعت، مال اور وقت کا صرف کثیر کر کے ماچھی گوٹھ کے مقام پر جمع تو اس خیال سے ہوں کہ پالیسی اور طریقِ کار کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گے اور وہ اپنے آئندہ لائحۂ عمل کے بارے میں خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے —— لیکن ہو یہ کہ پھر شوریٰ کی ایک "متفقہ مصالحتی قرارداد" ان کے سامنے پیش کر دی جائے —— اور وہ جیسے جائیں ویسے ہی لوٹ آئیں —— تو راقم الحروف نے جماعت اسلامی منٹگمری کے پانچ دوسرے ارکان کی معیت میں ایک متفقہ تحریر قائم مقام امیر جماعت کی خدمت میں ارسال کی —— جو درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی و مکرمی —— قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

"ہم اراکین جماعتِ اسلامی منٹگمری آپ کی وساطت سے مندرجہ ذیل امور مرکزی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو اجتماع ارکان سے قبل منعقد ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس تحریر کو اس اجلاس میں پڑھ کر سنا دیں گے۔

۱۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس امر کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بجائے اس کے کہ آئندہ اجتماع ارکان میں پالیسی کے متعلق تمام آراء من وعن پیش ہوں اور ایک کھلی بحث کے بعد پالیسی کا تعین کیا جائے اس سے قبل شوریٰ ہی میں پالیسی کے بارے میں اربابِ حل وعقد کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور ارکان جماعت کے سامنے اسی طرح کی کوئی متفقہ قرارداد پیش کی جائے جیسی کہ شوریٰ نومبر دسمبر ۱۹۵۶ء میں منظور ہوئی تھی، اور تمام اراکین شوریٰ بجائے اپنی اپنی آراء کو پیش کرنے کے اجتماعِ ارکان میں اس قرارداد کی حمایت کریں۔

نیز یہ کہ اس سمجھوتہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر پالیسی کی بحثیں اور اکابرینِ جماعت کے آپس کے اختلافات اجتماعِ ارکان میں لے آئے گئے تو پھر اس جماعت کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسی کوئی بھی کوشش خواہ وقتی طور پر کتنی ہی خوشنما اور مفید معلوم ہو جماعت اسلامی کے وجود اور استحکام کے لیے بالآخر سخت مضر اور مہلک ثابت ہو گی۔ لہٰذا ہم شوریٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ ایسی کسی تجویز کو زیرِ عمل لانے سے قبل وہ اس کے بظاہر مفید پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان مضر نتائج پر بھی غور کر لے کہ جو ہماری ناچیز رائے میں جلد یا بدیر لازماً رونما ہوں گے۔

۳۔ یہ بات اب ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن چکی ہے کہ جماعت اسلامی کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں میں پالیسی کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور ان کے حامل گروہ اپنے اپنے طرزِ فکر میں پختہ اور اپنی آراء میں شدید ہیں۔ ایک گروہ (جس کے ہاتھ میں اس وقت جماعت کی قیادت ہے) موجودہ پالیسی کو اس کے اصولی موقف کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تفصیلی فروعی تدابیر کے لحاظ سے بھی بالکل صحیح سمجھتا ہے اور اس میں کسی اصولی تغیر کو صحیح نہیں سمجھتا جبکہ دوسرا گروہ بعد از تقسیم ملک کی پالیسی کو قبل از تقسیم کی پالیسی کے لحاظ سے اصولی انحراف سمجھتا ہے اور موجودہ پالیسی میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ یہ دونوں گروہ پالیسی کے بارے میں اپنی اصولی آراء ہی کی حد تک نہیں بلکہ اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے بھی ایکدوسرے کی ضد واقع ہوتے ہیں۔

ان گروہوں کے درمیان جماعت میں ایک عرصہ سے کشمکش چلی آتی ہے۔ ابھی تک یہ کشمکش صرف اصحابِ شوریٰ تک محدود تھی اور عام ارکین کو اس کا علم تک نہ تھا لیکن اب اکثر باتیں اس محدود حلقہ سے نکل کر ایک وسیع دائرے میں پھیل گئی ہیں اور عام ارکین کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے باخبر ہو گئی ہے۔

۵۶ء میں ان دو گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی جو کوشش کی گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں جو مصالحتی فارمولا ارکین جماعت کے سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا ہے،

اس سے دو باتیں اخذ کی جانی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ان دو گروہوں کے درمیان مصالحت اور سمجھوتہ کی کوشش لاحاصل ہے۔ یہ اپنے نقطہ ہائے نظر، اپنے طرز ہائے فکر اور اپنے مذاق و رجحان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کو نزدیک لانے کی کوشش ایک مبارک خواہش تو کہی جا سکتی ہے لیکن عملاً بارآور نہیں ہو سکتی اور دوسرے یہ کہ آج سے قبل شوریٰ کی کلھیا میں جو گڑ پھوڑا جاتا رہا ہے وہ اب چوراہے میں بکھر گیا ہے۔ اور اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی کہ باتیں صرف اراکین شوریٰ تک محدود رہتیں، جماعت کے دست و بازو یعنی ارکان اس سے واقف نہ تھے۔ اب یہ باتیں پھیل چکی ہیں۔ اب اگر "بڑے آدمی" مل کر بیٹھ بھی جائیں تو "چھوٹوں" کا خلجان رفع ہونا مشکل ہے۔

۴۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک جماعت کا بقا اور اس کے استحکام اور اس کے عملاً کوئی کام کر سکنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آئندہ اجتماع ارکان میں ہر شخص کھلے دل کے ساتھ جو کچھ دل و دماغ میں رکھتا ہے، ارکان کے سامنے رکھ دے اور ایک عام اور کھلی (OPEN HEARTED) بحث کے بعد طے ہو جائے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اپنے مستقبل کے لیے کون سی پالیسی کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد جس کو اس پالیسی پر انشراح صدر ہو جائے وہ جماعت میں رہے اور جو انقباض محسوس کریں ان کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا پہلو اسی میں ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت کو چھوڑ جائیں اور اپنے ذوق اور نظریات کے مطابق جو کام بھی کر سکتے ہوں علیحدہ ہو کر کرتے رہیں۔ اس صورت میں خواہ وقتی طور پر جماعت کو ایک نقصان برداشت کرنا پڑے اور ایسا محسوس کیا جائے کہ جماعت کو ایک بڑا دھکا لگا ہے لیکن بالآخر یہ محسوس کیا جائے گا کہ اسی میں جماعت کی بھلائی تھی۔ اس طرح جماعت کو ایک مرتبہ پھر یکسوئی، یکرنگی اور یک جہتی حاصل ہو جائے گی اور وہ سکون کے ساتھ ایک طرف جا سکے گی۔

۵۔ اس کے برعکس اگر اس وقت "انتشار کے خوف" سے ایک مصالحت کر بھی لی گئی تو اول تو اس بات ہی کا قوی اندیشہ ہے کہ پہلی مصالحت کی طرح یہ بھی زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی "طویل" عمر پا سکے۔ لیکن اگر اس مرتبہ جماعت کے اکابرین نے ذرا زیادہ بڑے ظرف کا

ثبوت دیا۔ تب بھی یہ تو یقینی ہے کہ جماعت زیادہ دور نہ چل پائے گی کہ یہ کشمکش پھر پیدا ہو کر رہے گی اور جماعت اپنی اندرونی کشمکش میں اسطرح اُلجھ کر رہ جائے گی کہ اور کوئی مفید کام اس کے لیے ممکن نہ رہے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ یہ کشمکش "خفی" رہے اور پہلے کی طرح "جلی" نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ختم ہو جائے۔

6۔ اس وقت کی "مصالحت" کے بارے میں تین باتیں بالکل واضح ہیں۔

(الف) یہ کہ اس کی بنیاد کسی مثبت جذبے کی بجائے ایک "منفی خدشہ" پر ہے اس وقت محض انتشار کے خطرے سے بچنے کی غرض سے یہ کوشش کی جا رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ گفت و شنید اور بحث و مباحثہ کے بعد ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کے قریب آنے کی وجہ سے مفاہمت ہو رہی ہو اور اب فریقین اپنے اپنے مقام سے واقعتہً ہٹ کر ایک جگہ آ کھڑے ہوئے ہوں ـــــ صورتِ حال یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ (بلکہ حالیہ واقعات نے تلخی میں اضافہ کر دیا ہے) لیکن انتشار کے خوف سے دبک کر بیٹھ رہے ہیں۔ اس طرح "حبِّ علیؓ" کی بجائے "بغضِ معاویہ" پر جو اتحاد قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہو گی۔

(ب) مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کے ارادوں اور ان کی نیتوں کے بارے میں کوئی بات نہ کہی جا سکے تو بھی "اختلاف" رکھنے والے لوگوں کے بارے میں تو ہمیں یقین کے ساتھ یہ بات معلوم ہے کہ وہ اس موقع پر مصالحت اس لیے کر رہے ہیں کہ آئندہ کشمکش کا موقعہ باقی رہے۔ عین اس وقت جبکہ یہ حضرات مصالحت کی باتیں کر کے اُٹھے ہوتے ہیں ان کی آراء دوسرے لوگوں کے بارے میں انتہائی سخت ہوتی ہیں اور اپنے طرزِ فکر کے لوگوں کے سامنے سخت ترین آراء کا اظہار کرتے ہیں کوئی باک محسوس نہیں کرتے ـــ اس لحاظ سے کم از کم ہم لوگوں کو تو یہ ایک "منافقانہ مصالحت" معلوم ہوتی ہے، جس کا چند روز سے زیادہ چل جانا مشکل اور کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔

(ج)۔ مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خیریت اسی میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ اجتماع گذر جائے۔ اس وقت ان کے لیے اپنے نقطۂ نظر کو پیش

کر کے اور اپنی بابت پر اصرار کر کے اجتماع میں کامیابی مشکل نظر آرہی ہے۔ کہاں تو وہ کیفیت تھی کہ اپنے وجوہ استعفا انہوں نے اجلاس شوریٰ میں بیان کرنے کی بجائے اجتماع ارکان میں رکھنے مناسب سمجھے تھے اور ۱۹۴۱ء سے آجتک مختلف اوقات و ادوار میں اپنی اختیار کردہ پالیسی کو ایک طویل تقریر میں پیش کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ کہاں اب یہ باتیں سننے میں آرہی ہیں کہ وہ ایسی کوئی تقریر بھی نہیں کریں گے۔ اور اپنے استعفا کے وجوہ بھی سامنے نہیں لائیں گے۔

۷۔ ان حالات میں شوریٰ سے ہماری درخواست یہ ہے کہ اب مصالحت اور مفاہمت کی کسی نئی کوشش میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور اس سے قبل کی ایسی ہی کوشش اور اس کے انجام سے عبرت حاصل کر کے آئندہ اجتماعِ ارکان کی نوعیت وہی رکھی جائے جو اس کا اعلان کرتے ہوئے پیشِ نظر تھی ـــــ یعنی یہ کہ مولانا مودودی صاحب جو اس تحریک کے داعی، مؤسس اور از یوم تاسیس تا امروز قائد اور امیر رہے ہیں۔ وہ تفصیل کے ساتھ اور بغیر کسی MENTAL RESERVATION کے اپنا ذہن جماعت کے ارکان کے سامنے رکھ دیں اور ماضی کی پالیسی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ صاف صاف بتا دیں کہ آئندہ وہ جماعت کو کس رُخ پر لے کر جانا چاہتے ہیں اس کے بعد تمام ارکانِ جماعت عام اس سے کہ وہ عام رکن ہوں یا رکن شوریٰ اگر اس سے کوئی فروعی یا اصولی اختلاف رکھتے ہوں تو اسے واضح کر ایک کھلی بحث کے بعد طے ہو جائے کہ آئندہ پالیسی کیا ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ اس پالیسی سے مطمئن نہ ہوں وہ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنے نظریات کے مطابق جو کام کر سکتے ہوں کریں اور جماعت یکسوئی کے ساتھ اپنی طے کردہ پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔

ہماری ناچیز رائے میں اسی میں جماعت کی بھلائی مضمر ہے۔!!!

خطرہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس طرح جماعت منتشر ہو جائے گی۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ جماعت ایسی ہی کچّی بنیادوں پر قائم ہے کہ ایک مرتبہ کی OPEN DISCUSSION ہی سے ختم ہو جائے گی تو آپ کس چیز کے بھروسے پر اسے آگے لئے جا رہے ہیں؟ جو جماعت اندرونی اختلاف کا ایک حادثہ برداشت نہ کر سکے وہ آخر آگے کیا کام کر سکے گی ـــــ؟ دوسرے یہ کہ اگر واقعۃً گند اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے آتے ہی

یہ جماعت نسیاً منسیاً ہو جائے گی تو پھر آخر آپ اس کو چھپا کر کب تک رکھ سکیں گے؟

۸۔ اگر یہ چیز منظور نہ ہو اور یہ چیز متفق علیہ ہو کہ اسطرح جماعت ختم ہو جائے گی تو پھر ہماری گزارش شوریٰ کے اختلاف کرنے والے گروہ سے یہ ہے کہ وہ لوگ جماعت کے اتنے ہی خواہ ہیں تو پھر ان کو چاہیئے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں۔ ایک ایسی جماعت کو کہ جو ابھی منزل مقصود سے بہت دور ہے اور جسے اپنا مقصود حاصل کرنے کے لئے ابھی ایک طویل اور SOLID جدوجہد کرنی ہے، آپس کی کشمکش میں مبتلا کئے رکھنے کو اس کی خیر خواہی سمجھنا حماقت نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ اگر وہ اس پر بضد ہیں کہ جماعت میں رہنا بھی ہے اور اسے اپنے نظریات پر موڑنا بھی ہے تو یہ موقع موجود ہے۔ دیانت داری کے ساتھ اپنی بات ارکان کے سامنے رکھ دیں اگر جماعت انکی بات مان لے تو فبہا ورنہ پھر سیدھے سیدھے جماعت کو دوسری طرف جانے دیں اور مزید روڑے نہ اٹکائیں نہ اس جماعت کی چلتی گاڑی کو بریک لگا کر کھڑا رکھ چھوڑیں اور اگر وہ اس میں جماعت کی تباہی دیکھتے ہیں اور یہ انہیں ناپسند ہے تو پھر ایک ہی راہ ہے کہ خاموشی سے علیحدہ ہو جائیں۔

۹۔ ..... اور اگر نہ شوریٰ ہماری بات مانے ــــ نہ اختلاف کرنے والے حضرات کو ہماری بات سے اتفاق ہو تو پھر ہم اپنے بارے میں دو شکلیں تجویز کرتے ہیں۔

(۱) یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماعِ ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں۔ اس کام کے لئے جتنا وقت ہمیں درکار ہو دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ نہیں! ــــ تاکہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم "منافقت" کے ساتھ جماعت کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں اس لئے کہ اسطرح آخرت میں اجر تو دور رہا۔ عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے ــــ اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہوں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ ــــ نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔

(ب) ..... اور اگر یہ بھی قابلِ قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لیے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بنکر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی بھی انشاء اللہ جماعت کے لیے نقصان کا موجب نہ ہوگی۔ بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی کوئی نہ کوئی خدمت ہی سرانجام دے سکیں گے۔

مزید تشریح مناسب ہے۔ کہ بصورت اول ہمیں کم از کم اتنا وقت درکار ہے کہ ہم اپنے اس متفقہ بیان کو جو ہم نے جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا پڑھ کر اجتماعِ ارکان میں سنا دیں اور آئندہ کے بارے میں ایک قرارداد مرتب کر کے اسے وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

ہم ۱۶ تاریخ تک کسی اطلاع کے منتظر رہیں گے اور صرف پہلی شکل کی منظوری کی صورت میں اجتماع کے لیے حاضر ہوں گے براہِ کرم ہمیں ۱۶ فروری کو بارہ تا ۲ بجے دوپہر فون ۱۵۷ پر فیصلہ سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ ہم اجتماع میں شریک ہونے، یا یہاں کے دوسرے ارکان کے ہاتھ اپنے استعفٰے بھجوانے کا فیصلہ کر سکیں — فقط والسلام!

ہم ہیں اراکین جماعت اسلامی منٹگمری

(چھ اراکین کے دستخط)

اس تحریر کے جواب میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا گیا کہ اجتماعِ ارکان میں سب کو اظہارِ رائے کا پورا موقعہ دیا جائے گا!

حاشیہ صفحہ گذشتہ شوریٰ کے اس اجلاس نے یہ بھی طے کیا کہ :-

"چونکہ اس مجلس شوریٰ نے اجتماعِ ارکان کی اس ضرورت کو محسوس کر کے منعقد کرنا طے کیا ہے کہ ارکانِ جماعت آزادانہ بحث کر کے جماعت کی آئندہ پالیسی اور لائحہ عمل طے کریں اور مجلس شوریٰ کی یہ خواہش ہے کہ پالیسی کی اس بحث میں کوئی سابق فیصلہ کسی حیثیت سے حائل نہ ہو اس لئے مجلس شوریٰ یہ مناسب سمجھتی ہے کہ مجلس نے اپنے

گذشتہ اجلاس میں جو قرارداد پالیسی کے متعلق پاس کی تھی وہ آئندہ کل پاکستان اجتماع ارکان کے وقت آغاز سے کالعدم قرار پاتے "

شوریٰ کے اس فیصلے پر شیخ سلطان احمد صاحب نے باصرار اپنا یہ اختلافی نوٹ (NOTE OF DISSENT) ریکارڈ کرایا کہ

"مجلس شوریٰ نے اپنے گذشتہ اجلاس منعقدہ ۲۵ نومبر تا ۹ دسمبر ۱۹۵۶ء کے اختتام پر خوب اچھی طرح بحث اور غور کر لینے کے بعد جماعت اسلامی کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ مجلس کی طرف سے ایک متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے ارکان جماعت کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس پر شرکائے مجلس میں سے کسی نے بھی اپنے اختلاف کا اظہار آخر وقت تک بھی نہیں کیا تھا۔

اب اگر ارکان جماعت یا ارکان شوریٰ یا امیر جماعت کو اس فیصلہ پر اطمینان نہیں ہو سکا ہے یا شوریٰ کی قرارداد کی تشریح اور تعبیر میں اختلاف واقع ہو رہا ہے تو میری رائے میں اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسی مجلس کے سامنے تمام اعتراضات اور عدم اطمینان کے وجوہ پیش ہونے چاہئیں تاکہ پچھلی بحثوں کے تمام پہلوؤں اور گذشتہ اجلاس کی کارروائی کو از سر نو تازہ کئے بغیر پیش نظر رکھتے ہوئے مجلس اپنی قرارداد پر عائد شدہ اعتراضات پر کماحقہٗ غور کر سکے۔ اس کے بعد ہی شوریٰ اس فیصلہ کی ترمیم، تنسیخ یا توثیق کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہوگی۔ اگر خدانخواستہ مجلس شوریٰ دوبارہ غور کر لینے کے بعد متفق الرائے نہ ہو سکے تو پھر اختلافی امور لغرض استصواب متعین طور پر ارکان جماعت کے اجتماع عام میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور وہاں ایک ایک مسئلہ پر اظہار رائے کے بعد آخری اور قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن اعتراض یا بے اطمینانی کی وجہ سامنے رکھے اور اس پر کوئی رائے ظاہر کئے بغیر مجلس شوریٰ کی ایک متفقہ قرارداد کا خود بخود کالعدم قرار دیا جانا میرے نزدیک بالکل غلط، جماعت کے لیے ایک بری نظیر اور مجلس کے لیے سخت بدنامی کا باعث ہوگا اور اس طرح شوریٰ کا یہ تازہ فیصلہ اشخاص اور جماعت کے بارے میں عائد شدہ بعض نہایت سخت الزامات کی نادانستہ طور پر تصدیق کر دینے کا ہم معنی بن جائے گا۔

بنا بریں میں اس فیصلہ سے اپنے اختلاف کا صاف صاف اظہار کر رہا ہوں۔"

سلطان احمد ۱۳ر جنوری ۱۹۵۷ء

لیکن جب اس اجلاس شوریٰ کی کارروائی جماعت میں شائع (CIRCULATE) کی گئی تو

"فرطِ احتیاط" سے اس اختلافی نوٹ کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ اس پر شیخ سلطان احمد صاحب نے حسبِ ذیل 'احتجاج' جناب قیم جماعت کی خدمت میں ارسال کیا:-

"آپ کا سرکلر نمبر ۲۷-۴-۱۱۸ مؤرخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۵۷ء موصول ہوا۔

اس مراسلہ میں آپ نے مرکزی مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۲ تا ۱۵ جنوری ۵۷ء کی روداد اور فیصلے شائع کئے ہیں لیکن پیراگراف نمبر ۵ میں جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں شوریٰ کا فیصلہ درج کرتے ہوئے آپ نے نہ صرف اس کی کوئی تصریح نہیں فرمائی ہے کہ یہ فیصلہ متفقہ طور پر ہوا ہے یا ارکانِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے سے بلکہ آپ نے میرے اختلافی نوٹ کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ہے جو میری رائے میں قابلِ اعتراض بات ہے۔

کسی مجلس میں فیصلہ کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں یا متفقہ طور پر اور یا کثرتِ رائے سے۔ پہلی صورت میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں لیکن دوسری صورت میں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ فیصلہ اکثریت کا ہے نہ کہ پوری مجلس کا ـــــ آرا کا شمار یا اختلاف کرنے والوں کے بارے میں تفصیل بیان کرنا بے شک ضروری نہیں مگر جہاں رائے شماری کی نوبت آنے سے پہلے ہی کسی رکن کی طرف سے تحریری طور پر اختلافی نوٹ پیش کر دیا گیا ہو وہاں یہ لازمی ہے کہ فیصلہ کے ساتھ ساتھ اختلاف کرنے والے کے وجوہ و دلائل بھی سامنے رکھے جائیں تاکہ اختلافی نقطۂ نظر پر بھی لوگ غور کر سکیں۔

اختلافی نوٹ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو محض کارروائی کے رجسٹر میں بند کر دیا جائے اور محض یک طرفہ رائے لوگوں کے علم میں لائی جائے۔ خصوصیت کے ساتھ اس نوٹ کی اشاعت اس لئے اور بھی ضروری تھی کہ اس میں اختلاف کرنے والے نے آنے والے اجتماعِ ارکان سے متعلق مجوزہ کارروائی ہی سے اختلاف کیا ہے اور اس بات پر متنبہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرز پر اجتماعِ ارکان کی کارروائی ہونے جا رہی ہے اس سے جماعت کو بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اب اگر ارکانِ جماعت اس خطرہ سے بروقت آگاہ نہیں کئے جاتے پھر اس تنبیہہ کا موقع کب باقی رہیگا ـــــ اگر آپ کا ارادہ میرے اختلافی نوٹ کو سرے سے شائع کرنے ہی کا نہیں ہے یا آپ اس کو اجتماعِ ارکان کے بعد یا عین وقت پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں میری رائے یہی ہے کہ میرا یہ اختلافی نوٹ اجتماع سے پہلے پہلے ارکانِ جماعت کے علم میں لایا جانا چاہیئے اس لئے میں اس مسئلہ پر آپ کی فوری توجہ مبذول کرا رہا ہوں" فقط والسلام　　احقر سلطان احمد

لیکن یہ احتجاج بھی صدا بصحرا ثابت ہوا ـــــ!

فتنوں کا استیصال ہو گیا ہے اور صرف ایک ہی ''فتنہ'' (جماعت اسلامی) باقی رہ گیا ہے؟ وغیرہ جس کا قلع و قمع کرنا ضروری ہے ۔ آپ وضاحت سے بیان کریں کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے ذریعے سے کون کون سی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں جنہیں دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جماعت اسلامی کو ختم کیا جائے اور مولانا مودودی کو Expose کیا جائے ۔

۳ ۔ اگر جیسا کہ آپ فرماتے ہیں ابتداء میں جماعت اسلامی کا پروگرام بالکل ٹھیک تھا تو جب سے آپ اور آپ کے ہم خیال جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں آپ حضرات نے اب تک اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہی خطوط پر علیحدہ جماعت کیوں نہیں بنائی ہے؟ آپ حضرات نے اپنا مقصد حیات یہی کیوں بنا لیا ہے کہ جس طرح ہو سکے جماعت اسلامی کو ختم کر دو ۔ کیا اس کی اصل وجہ یہ تو نہیں ہے کہ آپ لوگوں نے ان مصائب اور مشکلات سے بچنے کے لیے جو بہر حال اس قسم کی جماعت کو پیش آتی ہیں کہیں فرار کا طریقہ تو اختیار نہیں کیا ہے اور احساس کمتری کے زیر اثر آپ نے جماعت اسلامی کے خلاف ہی مہم شروع کر دی ہے حالانکہ آپ کے ہم خیال حضرات برسوں تک جماعت اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اپنی بساط کے مطابق پوری کوشش کرتے رہے ہیں اور اگر آپ اب جماعت اسلامی کے انہی خطوط پر جن کو آپ صحیح سمجھتے ہیں ایک نئی جماعت تشکیل کریں تو آپ کو ڈر ہے کہ آپ لوگ بالکل Expose ہو جائیں گے ۔

۴ ۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پروگرام مکہ میں پیش کیا تھا کیا وہی پروگرام مدینہ میں بھی جاری رکھا گیا تھا؟ اگر نہیں تو آپ اس کی کیا توضیح کریں گے ؟

فی الحال انہی سوالات پر اکتفا کرتا ہوں اگر آپ واقعی خلوص دل سے یہی سمجھتے ہیں کہ جماعت کو مٹانا ہی ایک اعلیٰ نصب العین ہے تو آپ صرف میرے سوالات کو ان کے جوابات کے ساتھ شائع کر دیں ، کیونکہ یہ تو مختصر سے سوالات ہیں اور مختصر سے جوابات چاہتے ہیں ۔ یہ چند سطور یہ سمجھ کر آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ کو کوئی مغالطہ لگا ہوا ہے یا آپ احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں اور اس سے بچنے کے لیے آپ نے جماعت اسلامی کو اپنے انتقام کے لیے ہدف بنا لیا ہے کیونکہ یہ کام کسی خطرے کے بغیر کیا جا سکتا ہے بلکہ اس طرح تحسین و آفرین کی داد بھی مل سکتی ہے ۔ آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ میری اس چٹھی کی رسید سے مجھے اطلاع دیں گے اور یہ کہ اس کے متعلق کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ میں آپ کے جواب کا ۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء تک انتظار کروں گا اگر آپ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ آپ اس کے متعلق کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

اس قسم کے خطوط اگرچہ کچھ عرصے سے مدیر 'میثاق' کی ڈاک کا مستقل جزو ہیں اور 'نقض غزل' کی گذشتہ قسط کی اشاعت کے بعد ان میں ایک نمایاں اضافہ ہو گیا ہے تاہم ابتک ہم نے انہیں لائق اعتناء نہیں سمجھا تھا ـــــ لیکن مندرجہ بالا خط ایک تو اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ یہ جماعت اسلامی کے ایک اہم اور نمایاں

Regd. No. L. 7360.

onthly "MEESAAQ" Lahore

ol. 12 | DECEMBER 1966 | No. 6

رکن ـــــ یعنی جناب چودھری محمد اکبر صاحب (مراد پور - ضلع سیالکوٹ) ارسال کردہ ہے دوسرے اس میں انداز بھی تحدی (Challenge) کا اختیار کیا گیا چنانچہ اسے بصیغۂ رجسٹری ارسال کیا گیا ہے اور ایک متعین تاریخ تک جواب طلب فرمایا گیا ہے - لہذا اس خط کی جانب 'التفات' ناگزیر ہے -

اس مرتبہ ہم نے چودھری صاحب کا عنایت نامہ 'من و عن' پیش کر دیا آئندہ اشاعت میں ہم اپنی گزارشات عرض کریں گے - انشاء اللہ !

(۲)

'نقض غزل' کی گذشتہ قسط راقم الحروف نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تحر کی تھی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علم میں وہ طباعت کے بعد ہی آئی لیکن بحمد اللہ مولانا نے نہ صرف اس کی مجموعی اعتبار سے مکمل تصویب فرمائی بل شدت تاثر میں بار بار یہ شعر مولانا کی زبان پر جاری ہوتا رہا کہ

سر خدا کہ عارف وسالک بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید !

اس مضمون کی حالیہ قسط میں راقم الحروف نے مولانا کے موقف سے اخ بھی کیا ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے - مولانا کی انصاف پسندی سے توقع ہے کہ اس پر بھی 'ہمدردانہ' غور فرمائیں گے -

اسرار احمد

(۳)

قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی وفات ایک ملی سانحہ ہے - وہ مخلص اور دردمند خادم دین تھے اور ایک خوش بیان اور صاحب تاثیر واعظ ہونے ساتھ ساتھ نہایت متواضع اور ملنسار تھے - ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے سے پر ہو سکے گا - ہم قاضی صاحب مرحوم کے لیے مغفرت کی اور ان کے پس ماند کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں -

امین احسن اصلاحی

محی الدین پبلشر نے باہتمام محمد طفیل مالک نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر دارالاشاعت الاسلامیہ بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر، لاہور-۱ سے شائع کیا -